کرشن چندر

Krishan Chander

کرشن چندر

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

اس کا نام اُردو کے چند صفِ اوّل کے افسانہ نویسوں میں سب سے نمایاں ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ جدید اُردو افسانے کے معماروں میں سب سے آگے نظر آتا ہے۔ منشی پریم چند کے بعد کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کی ہمسری کا دعوے دار نہیں۔ تقسیمِ ہند سے قبل شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں میں بھی وہ سب سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آخر میں مشہور طنز نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحب زادی سلمٰی صدیقی سے شادی کرکے اس نے ایک نیا دھماکہ کر دیا۔ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اب اس کی شخصیت کا ایک نیا روپ سامنے آیا جس پر ہندو اور مسلمان دونوں کا ردِ عمل مختلف تھا۔ بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے اور اپنی شخصیت اور کام سے برِ صغیر کو متاثر کرنے والوں میں اس کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ دیکھئے اس تخلیق کار نے زندگی کو کس طور دیکھا اور زندگی نے اسے کیا دیا۔

اُردو زبان کے قد آور افسانہ نگار کرشن چندر کی دلچسپ سرگزشت

فلم یونٹ کے پہنچنے کی خبر ملتے ہی شوٹنگ دیکھنے کے لیے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔

یہ قافلہ اس وقت ریاست کشمیر کے علاقے پونچھ میں تھا۔ سرکاری افسران نے پُرتپاک استقبال کیا اور ڈاک بنگلے کے دروازے کھول دیے۔ اب یہاں پرانے ڈاک بنگلے کے ساتھ ساتھ نیا ڈاک بنگلا بھی بن گیا تھا۔

پرانے بنگلے کو دیکھتے ہی' پرانی یادوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اسی بنگلے میں' جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا' ٹھاکر چین سنگھ اور ٹھاکر موہن سنگھ کے ساتھ میدان میں کھیلنے کے بعد آیا کرتا تھا۔ ڈاک بنگلے کا ایک کمرا ان کے لیے کھول دیا جاتا تھا جہاں وہ قریب کی باؤلی سے جھرنے کا ٹھنڈا پانی منگواتے اور لیموں کا شربت پیتے۔ گراموفون پر سہگل' جانکی بائی آگرے والی یا کلو قوال کے ریکارڈ بجائے جاتے۔

وہ ڈاک بنگلے سے نکل کر توپ خانے کے میدان' جیل' ڈاک گھر سے ہوتے ہوئے اسی اسپتال تک گیا جہاں کبھی اس کے پتا جی بیٹھا کرتے تھے۔ اسپتال وہی تھا لیکن پتا جی نہیں تھے۔ اب وہاں ایک نوجوان ڈاکٹر شرما بیٹھے تھے۔

اس کے پرستار یہاں بھی موجود تھے۔ اسکول اور کالج کے لڑکے لڑکیوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ افسانہ نگاری کا بے تاج بادشاہ کرشن چندر ان کے درمیان موجود تھا جو پوری چار دہائیوں کے بعد اس علاقے میں آیا تھا۔ جس زمین پر اس کے قدموں نے کھیلنا سیکھا تھا' جہاں اس کی معصومیت عشق کے مفہوم سے واقف ہوئی تھی' جہاں اس کا شباب رنگوں میں نہایا تھا' وہاں اب ساٹھ سال کا بوڑھا' شہرت اور عظمت کی بلندیاں طے کرتا ہوا اس فلم یونٹ کے ساتھ آیا تھا۔ کیمرے اس کے بچپن کی یادوں کو محفوظ کرنے کے لیے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ اس کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے' اس کی زندگی پر مبنی ایک دستاویزی فلم بنائی جارہی تھی۔ اس کے دونوں بھائی مہندر ناتھ' اوپندر ناتھ اور بہن سرلا دیوی بھی اس کے ساتھ تھے۔

ایک شوخ سی لڑکی نے کرشن چندر کو گھیر لیا "مجھے افسانے لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ مجھے بتائیے کہ میں کس طرح ایک اچھی افسانہ نگار بن سکتی ہوں؟"

"دیکھیے آپ ایسا کریں" کرشن کے بھائی نے کہا "ایک اچھی افسانہ نگار بننے کے لیے آپ افسانے تو کرشن جی کے پڑھا کیجیے لیکن خط مجھے لکھا کیجیے۔"

اس برجستہ جواب پر ابھی قہقہے تھمے نہیں تھے کہ اس لڑکی نے یہ کہہ کر سب کو لاجواب کر دیا۔

"اچھا چاچا جی۔"

اس جواب پر جن قہقہوں کا طوفان اٹھا' وہ تھمنے والا نہیں تھا۔

ہر شہرت کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھنے والا کرشن' ان قہقہوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر وہ گھر تھا جہاں اس نے بچپن کے سہانے دن گزارے تھے۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ پتھر کا ہو گیا۔ وہی در و دیوار تھے اور وہی گھر میں لگا' دیوار سے باہر جھانکتا ہوا خوبانی کا پیڑ۔ وہ دیر تک اس دروازے کو تکتا رہا جسے ہاتھ لگائے اسے برسوں بیت گئے تھے۔ گھر سے بھاگے ہوئے بچے کی طرح

اطلاع دیے بغیر وہ آج اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ ہر لحظہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ ابھی دروازہ کھلے گا۔ گلابی کنارے والی ساڑی پہنے اس کی ماں جی دروازے پر آئیں گی اور ممتا بھرے لہجے میں کہیں گی "اتنے برس کہاں رہے بڑے کاکا۔ کہاں تھے تم۔ جلدی سے اندر آجاؤ۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ میں نے تمہارے لیے مکھن اور شہد بھرے پراٹھے تیار کیے ہیں۔"

تھوڑی دیر کو ماضی، حال پر غالب آگیا تھا لیکن جلد ہی حقیقت پسند کرشن پر یہ حقیقت کھل گئی کہ دروازہ کھولنے والی تو اب اس دنیا ہی میں نہیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس نے عینک کے اندر سے آنسو صاف کیے اور دل میں کوئی چیخا "ماں جی، باؤجی!" لیکن یہ پکار، آواز کے بغیر تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ رسوئی گھر میں اسے اپنی ماں بیٹھی نظر آئی۔ وہ سب بچوں کے لیے الگ الگ تھالیوں میں کھانا نکال رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

وہ کسی طرف بھی منہ پھیرلیتا۔ اس گھر میں تو ہر طرف اس کا بچپن کھڑا تھا۔

اس کی درازی عمر اور صحت مندی کے لیے پوجا پاٹھ کرانا اس کی والدہ کا معمول تھا۔ اس وقت بھی ایک ایسا ہی منظر اس کی آنکھوں کے تخت پر سجا ہوا تھا۔ برآمدے کا فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے ایک سفید کوری دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں ایک دھاگا پڑا ہوا تھا جسے جینئو کہتے ہیں۔ اس کی ماں نے اسے ایک چھوٹے سے غالیچے پر بٹھا کر پانچ سو بار گائتری منتر کا جاپ کرنے کو کہا۔ اتنے میں برہمن پجاری آگیا۔ ست ناجا (سات اناجوں کا آمیزہ) لکڑیاں تولنے والے کانٹے میں رکھ کر دوسرے پلڑے میں کرشن کو بٹھا دیا گیا۔ پجاری نے منتر پڑھنا شروع کر دیے۔

اتنے میں اسے باؤجی کی آواز آئی جو پوجا ختم ہونے کے بعد گھر میں داخل ہوئے تھے۔

"پجاری کا فراڈ پورا ہوگیا؟"

"ہاں ہوگیا۔" اس کی ماں نے تنک کر کہا۔

"اب اس کے بعد کیا گوردوارے جاؤ گی؟"

"ہاں ہاں۔ جاؤں گی، ضرور جاؤں گی۔ تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ کیوں نہ ہو، آریہ سماجی جو ٹھہرے۔ تمہارا تو کوئی مذہب ہی نہیں ہے۔"

اس کی آنکھیں رو رہی تھیں لیکن باؤجی کا خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ماں جی جتنی مذہب پرست تھیں، باؤجی اتنے ہی آزاد خیال تھے۔ وہ نہ مورتی پوجا کے قائل تھے اور نہ اوہام پرستی کے۔ اسے وہ جھڑپیں بھی یاد آگئیں جو مذہب کے موضوع پر اس کی ماں اور باپ کے درمیان ہوتی تھیں اور اکثر ہوتی تھیں۔

اس کے والد مے نوش بھی تھے، گوشت خور بھی۔ حسن پرست بھی تھے اور عاشق پیشہ بھی۔ میری ذات کا یہ حصہ شاید انہی کے خون کا اثر ہے، اس نے سوچا۔ اس کی نظروں میں ان عورتوں کے چہرے گھوم گئے جن کو اس نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دل نواز عورتیں دراصل وہ محبوبائیں تھیں جن کو اس کے باپ کی حسن پرستی نے اپنا اسیر بنالیا تھا اور جن کی وجہ سے اس کی ماں بہت پریشان رہتی تھی۔ اور ان کے پیچھے گھر میں روز جھگڑے ہوتے تھے۔ ان جھگڑوں میں فتح ہمیشہ اس کی ماں کی ہوتی اور عشق کی کہانی نامکمل ہی رہ جاتی۔

ان بہت سے چہروں میں اسے ایک سپیرن یاد آگئی۔ نہایت خوب صورت، جوان، تانبے کا سا رنگ، گہری سبز آنکھیں۔ سانپ پکڑنے آئی تھی لیکن اس کے باپ کی آنکھوں کی قیدی بن گئی تھی۔ اس کے باپ نے اسے مالی کی خالی کوٹھری میں ٹھہرا دیا تھا لیکن ماں جی پر راز کھل گیا اور پتا جی بے بس ہوگئے۔ چلتے وقت اس سپیرن نے کیسی دردناک بین بجائی تھی۔

باؤجی عام ہندوؤں کی طرح ذات پات کے قائل نہیں تھے۔ ان کا مذہب انسان دوستی تھا۔ یہ خیال آتے ہی اسے وہ بچی یاد آگئی جو اس کی خاطر بری طرح پٹ گئی تھی۔ اس کا نام تاراں تھا اور چمار کی بیٹی تھی۔ ماں جی نے اسے میرے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کھیل میں بھی رہا تھا لیکن ماں کا غصہ اس معصوم پر اترا۔ انہوں نے اسے بے تحاشا پیٹ ڈالا۔

"کم بخت، کمینی، اچھوت، کم ذات۔ آج پورن ماشی کے شبھ دن تو میرے بچے کے ساتھ کھیلتی ہے۔"

باؤجی نے اسے ماں کے چنگل سے چھڑایا اور اسے باغیچے میں لے گئے۔ اس کی جھولی سرخ سیبوں سے بھر دی۔

"خبردار جو آئندہ تم نے میرے بیٹے کو تاراں سے کھیلنے کو منع کیا" انہوں نے ماتا سے کہا۔

"تاراں اچھوت ہے۔ چمار کی بیٹی ہے۔"

"چمار کی بیٹی ہے تو کیا ہوا۔ کیا انسان نہیں ہے؟"

"تم اپنے دھرم کو اپنے پاس رکھو۔ میں اپنے بیٹے کو تمہاری طرح ناستک (دہریہ) نہیں بننے دوں گی۔"

وہ سوچ رہا تھا، مجھے پتا جی اس دن بہت اچھے لگے تھے۔ میں بھی جب بڑا ہوا تو انہی کے نقش قدم پر چلا۔ میں نے بھی اونچ نیچ کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ میں نے بھی خوب عشق کیے۔

میں نے بھی خوب شراب پی۔ میں نے بھی انسان‘ انسان میں تفریق نہیں کی لیکن ہوا کیا؟ چمار کی بیٹی تو اب بھی اچھوت ہے۔

یہ فلم بنانے والے در و دیوار کو قید کرسکتے ہیں لیکن کیا میرے دل میں اٹھنے والے جذبات کے طوفان کو کیمرے میں قید کرسکیں گے؟

اسی عالم میں اور نہ جانے کب تک وہ ٹوٹتا بکھرتا رہتا کہ کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ یہ اس کی زندگی بھر کے مشاہدے کا ہاتھ تھا جو اسے اشاروں میں سمجھا رہا تھا کہ گئے وقت کو آواز دینا سعیِ لاحاصل ہے۔ وہ یادوں کے چوبارے سے ہٹ گیا جیسے دیوار سے دھوپ ہٹ جاتی ہے۔

وہ گھر پھر اسی طرح ویران ہوگیا۔ وہ گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کے خیالوں کی سپیرن‘ دردناک آواز میں بین بجا رہی تھی۔

اس کی تصانیف کے تراجم دنیا کی ساٹھ زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ اس نے برصغیر کی حدود سے نکل کر بین الاقوامی میدان میں بھی نام پیدا کیا۔ اس کی تصانیف کی لاکھوں جلدیں فروخت ہوچکی ہیں۔ اس کے افسانوں کے سامنے شعرا کی غزلیں پھیکی ہیں۔ دل کے دو دورے پڑچکے ہیں لیکن نہ وہ تھکا ہے نہ اس کا قلم۔ افسانے کی آبرو ہے کرشن چندر۔

یہ وہ خیالات تھے جو اہالیانِ شہر نے اس کی خدمت میں پیش کیے۔

اعزازات سے لدا پھندا کرشن چندر اپنی سوچوں میں گم اپنی زندگی کی اس کہانی کی ابتدا پر غور کررہا تھا جہاں کیمرے کی آنکھ نہیں پہنچ سکتی تھی۔

○☆○

”پتاجی! عشق کسے کہتے ہیں؟“

”عشق؟“ اس کے پتا چونک کر بولے ”عشق ایک حماقت ہوتی ہے۔“

”حماقت کسے کہتے ہیں؟“

”تم ابھی بچے ہو۔ اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ جب بڑے ہوجاؤ گے تو خود معلوم ہوجائے گا‘ عشق کسے کہتے ہیں۔“

”نہیں‘ نہیں۔ میں تو ابھی معلوم کروں گا۔“

وہ اپنے والد کی انگلی پکڑے چلتا رہا اور عشق کے معنی جاننے پر اصرار کرتا رہا۔

دونوں باپ‘ بیٹے ڈراما دیکھنے تھیٹر گئے تھے۔ شیکسپیئر کا شہرۂ آفاق ڈراما تھا۔ اسٹیج پر ہیملٹ پُرجوش انداز میں اپنی محبوبہ اوفلیا سے اظہارِ عشق کرتا ہے۔ بازو ہلا ہلا کر‘ چیخ چیخ کر اپنے عشق کا اعلان کرتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے

سوانحی خاکہ

نام ——— کرشن چندر
والد ——— گوری شنکر
آبائی وطن ——— وزیر آباد (پاکستان)
پیدائش ——— بھرت پور (راجستھان)
تاریخِ پیدائش ——— ۲۳ نومبر ۱۹۱۳ء
تعلیم ——— ایم اے‘ ایل ایل بی
ملازمت ——— آل انڈیا ریڈیو
بیوی ——— ودیاوتی
سلمیٰ صدیقی
وفات ——— ۸ مارچ ۱۹۷۷ء بہ مقام بمبئی۔

عشق کا لفظ سنا اور اب اس کے معنی جاننے کے لیے بے چین تھا۔ جب اس کی ضد کے باوجود اس کے والد اسے عشق کے معنی نہ سمجھا سکے تو وہ رونے لگا۔

وہ گھر پہنچا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ آنسو خشک ہوکر رخساروں پر جم گئے تھے۔ ماں پر نظر پڑتے ہی اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس کی ماں اس کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

”کیا ہوا میرے بچے کو؟“

”پوچھتا ہے عشق کسے کہتے ہیں؟“

”ہائے رام! یہ عمر اور یہ لچھن۔ اور لے کر جاؤ اسے تھیٹر۔“

”ماں!“ وہ زور سے چیخا ”میں بھی عشق کروں گا جیسے وہ آدمی تھیٹر میں کرتا ہے۔“

ماں نے غصے میں آکر پے در پے دو تھپڑ اس کے گیلے رخساروں پر رسید کیے ”ہاں بیٹا‘ تو کیوں نہیں عشق کرے گا۔ عشق بھی کرے گا اور اپنے خاندان کا نام بھی ڈبوئے گا۔ میری تو تقدیر ہی خراب ہے۔ باپ کو روتی تھی‘ اب بیٹا بھی......“

اس کے پتا اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اسے عشق کا مفہوم سمجھانے سے قاصر رہے۔ وہ بھی یوں چپ ہوگیا جیسے کہہ رہا ہو‘ مت سمجھاؤ میں خود سمجھ لوں گا۔

میلوں تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیت‘ جنگل‘ ٹھنڈے اور گرم پانی کے چشمے اس کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ وہ جلد ہی لاہور کو بھول گیا جہاں وہ پونچھ (کشمیر) آنے سے پہلے اپنے تایا کے گھر رہا کرتا تھا۔

ڈاکٹر گوری شنکر‘ بھرت پور میں ملازمت کرتے تھے۔ ایک دن اپنے انگریز افسر سے جھگڑ پڑے۔ افسر اور پھر

انگریز۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کرشن چندر، مہندر ناتھ اور بیوی پرمیشوری دیوی کو اپنے بھائی کے پاس لاہور میں چھوڑا اور خود ملازمت تلاش کرنے میں لگ گئے۔ بہت تگ و دو کے بعد کشمیر کے ایک دور افتادہ علاقے پونچھ میں انہیں ملازمت مل گئی۔ قدم جمتے ہی انہوں نے بیوی بچوں کو بھی بلالیا۔

پونچھ کی کلچرل زندگی میں تھیٹر کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ گوری شنکر رنگین مزاج آدمی تھے۔ بڑی پابندی سے تھیٹر دیکھنے جاتے تھے۔ ایک دن کرشن چندر کو بھی لے گئے اور پھر اسے عشق کا مفہوم سمجھانے میں پسینے آگئے۔

اس سے پہلے کہ اس کا اصرار کوئی اور صورت اختیار کرتا، اس کے پتا کا تبادلہ پونچھ کی ایک تحصیل مینڈر میں ہوگیا۔

پانچ سال کی عمر میں اس کا داخلہ مینڈر کے پرائمری اسکول میں ہوگیا۔

وہ اپنی عمر سے آگے چل رہا تھا۔ اس میں مشاہدے کو جذب کرنے کی بے پناہ قوت تھی۔ جس چیز کو ایک مرتبہ دیکھ لیتا کبھی نہ بھولتا بلکہ اس پر غور کرتا اور نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا۔ اپنی اسی یادداشت کے طفیل وہ یہ جاننے کے لیے سرگرداں تھا کہ عشق کسے کہتے ہیں۔

ایک دن وہ اپنے باپ کے ساتھ اسپتال گیا جہاں اس کے باپ ڈاکٹر تھے۔ ایک دبلی پتلی، نازک اندام عورت۔ بوٹا سا قد، مرمریں جسم، پتلے پتلے گلاب کی پتیوں کے سے ہونٹ۔ ایک بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس کے باپ نے اس سے کرشن کا تعارف کرایا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔

وہ دق کی مریضہ تھی لیکن گوری شنکر کے علاج اور ہمدردی سے اس کا مرض ختم ہونے لگا تھا۔ اس کے رخساروں پر سرخی آگئی تھی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت نظر آنے لگی تھی۔ گوری شنکر اس عورت میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ گھنٹوں اس کے پاس جاکر بیٹھتے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ ٹہلنے کو بھی نکل جاتے۔ ہوتے ہوتے اسپتال میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بات اس کی ماں تک پہنچ گئی اور دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔

”سارا اسپتال تم پر تھو تھو کررہا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم اس عورت سے عشق لڑا رہے ہو۔“

کرشن نے ماں کی زبان سے عشق کا لفظ سنا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس کا مطلب ہے کسی خوب صورت عورت کے پاس بیٹھ کر ہنسنے بولنے کو عشق کہتے ہیں۔

یہ عشق کا اس سے پہلا تعارف تھا۔ اپنی اس کامیابی پر وہ بہت خوش ہوا کہ جو بات اس کے پتاجی نہ بتا سکے، اس نے خود جان لی۔

اس کی عمر اب دو چار سال اور آگے بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو کئی حسین عورتوں کے پاس بیٹھ کر ہنستے بولتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی فطری حسن پرستی اسے رہ رہ کر اکساتی تھی کہ وہ بھی کسی سے عشق کرے لیکن کس سے کرے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس کا شرمیلا پن بھی اسے اس راستے پر جانے سے روکتا تھا۔ پھر اسے ایک اور راستہ نظر آگیا جو اسے عشق سے بھی زیادہ دلچسپ نظر آیا۔

اس کا ایک ہم جماعت دیانند کپور تھا۔ اس کے باپ کی کتابوں اور رسائل کی دکان تھی۔ وہ ایک روز دیانند کے ساتھ اس کی دکان پر گیا تو اسے یوں لگا جیسے پیاسا کنوئیں کے پاس آگیا ہو۔ ایک رسالے پر اس نے مدیر کا نام گوری شنکر لکھا ہوا دیکھا۔ یہی نام اس کے والد کا بھی تھا اس لیے اسے شوق ہوا کہ وہ اس رسالے کو پڑھے۔ اس نے اپنے دوست سے وہ رسالہ مانگ لیا اور گھر آکر پڑھنے بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ کوئی ادبی رسالہ پڑھ رہا تھا۔

اسے نصاب کی کتابیں پڑھنے کا قطعی شوق نہیں تھا۔ اردو تو اسے قطعی نہیں آتی تھی۔ پانچویں جماعت تک اس نے یہ مشکل اردو پڑھی تھی۔ اس میں بھی ہر روز پٹتا ہی رہا تھا۔ روز روز کی مار سے تنگ آکر اس نے چھٹی جماعت میں اردو کو چھوڑ کر سنسکرت لے لی تھی لیکن اسے یہ بھی مشکل لگتی تھی۔

نصابی کتب سے اسے نفرت تھی لیکن جب رسالہ پڑھنے بیٹھا تو اٹک اٹک کر پڑھتا رہا مگر دلچسپی برقرار رہی پھر تو یہ حال ہوا کہ ایک کے بعد دوسرا رسالہ ختم کرتا رہا۔ جب ذرا مشق ہوگئی تو منشی پریم چند کی تصنیفات پڑھنا شروع کردیں۔

اس دکان پر شام کے وقت مقامی شعرا اور ادیب جمع ہوتے تھے۔ ان کے درمیان ہونے والی ادبی بحثوں کو وہ بڑے غور سے سنتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ وہ لوگ تھے جو نیند میں چلتے ہیں، خوابوں میں رہتے ہیں۔

”اردو سیکھنی ہے تو الف لیلہ پڑھو“ کسی ادیب نے اسے مشورہ دیا تھا۔ دکان پر یہ کتاب موجود تھی لہٰذا فوراً مل گئی۔ اس کتاب کی طلسماتی دنیا نے اسے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ کسی اور طرف دیکھنا ہی بھول گیا۔ نہ کھانے کی سدھ نہ کھیلنے کا ہوش۔ اس کا یہ انہماک دیکھ کر اس کی والدہ کو فکر لاحق ہوئی۔

”آپ اسے منع کیوں نہیں کرتے“ انہوں نے اپنے پتی سے کہا۔

”کس بات کو منع کروں؟“

”آپ تو کچھ دیکھتے ہی نہیں ہیں۔ اسکول کی کتابوں کا تو

'وہ دن بھر ناول پڑھتا رہتا ہے اور اب تو ا ہے۔ بگڑے گا نہیں تو کیا ہوگا۔"

ھر پڑھتا تو ہے۔"

نہیں سوچتے کہ اس کی آنکھیں کمزور یں ہیں۔ صحت الگ بگڑ جائے گی۔"

"اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑ دوں، آپ کو تو فکر نہیں ہے۔ میں بھی فکر نہ کروں۔"

"ہوتی رہو فکر میں دُبلی۔"

"آپ ہی نے تو بگاڑا ہے اسے" وہ بڑبڑاتی رہی اور گوری شنکر نے خاموشی اختیار کرلی۔

باپ کی طرف سے جب کوئی تہدیدی کارروائی نہیں ہوئی تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔

وہ جلد سے جلد دکان پر رکھی تمام کتابیں ختم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ شاید اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو بھی جاتا لیکن ساتویں جماعت پاس کرتے ہی اس کے باپ کا تبادلہ دوبارہ صدرِ مقام پونچھ میں ہوگیا۔

اب وہ پونچھ کے وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں آٹھویں کلاس کا طالبِ علم تھا۔

اس نے اردو کی جگہ سنسکرت لے لی تھی لیکن اب معلوم ہوا یہ تو اردو سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس نے آٹھویں میں سنسکرت کو بدل کر فارسی لے لی۔

ہر زبان کو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اردو اسے نہیں آئی، سنسکرت میں وہ نہیں چل سکا اور اب فارسی، یہ بھی اسے اتنی ہی مشکل لگتی تھی جتنی پچھلی دو زبانیں۔ مصیبت یہ ہوئی کہ وہ اس اسکول میں آتے ہی ماسٹر بلاقی رام نندہ کے ہتھے چڑھ گیا کیونکہ فارسی وہی پڑھاتے تھے اور بہت سخت استاد تھے۔ وہ کرشن چندر کو اس وجہ سے مارتے تھے کہ ایک تو اسے فارسی نہیں آتی تھی، دوسرے انہیں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ اخبار پڑھتا ہے۔ ان کے نزدیک اخبار بینی ہی ساری خرابیوں کی جڑ تھی۔

بلاقی رام کی مار وہ بڑے صبر سے سہہ رہا تھا۔ اسے خود حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنے مظالم کے بعد اب تک اسکول سے بھاگ کیوں نہیں گیا۔

○☆○

تھانے دار نیاز احمد، ڈاکٹر گوری شنکر کا جگری دوست تھا۔ اس پر راجا کی ہمشیرہ عاشق ہوگئی تھی۔ غضب یہ ہوا کہ راجا کو اس معاشقے کا علم ہوگیا۔ جابر حکمرانوں کا نزلہ رعایا پر ہی گرتا ہے۔ اس معاملے میں بھی قصوروار نیاز احمد ٹھہرا۔

نیاز احمد فرار ہوگیا تھا اور اس کی گرفتاری پر دس ہزار روپے کا انعام مقرر تھا۔ ریاست کی فوج اس کی تلاش میں پونچھ کا چپّا چپّا چھانتی پھر رہی تھی۔

کرشن چندر اس وقت گھر پر ہی تھا جب فوج کے سپاہی اس کے گھر بھی آئے۔ ایک ایک کمرے کی تلاشی لی لیکن نیاز احمد انہیں نہ مل سکا۔

اکثر بااثر لوگوں کے گھروں کی تلاشی لی جارہی تھی اس لیے کرشن نے اس کی پروا بھی نہیں کی، نہ اسے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے باپ سے کچھ پوچھتا۔

وہ رات کو سونے کے لیے لیٹا تو ماں کی دبی دبی سسکیوں سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس نے اہمیت نہیں دی کیونکہ ان دونوں کے درمیان اتنے اختلافات تھے کہ اکثر کسی نہ کسی بات پر تکرار ہوتی ہی رہتی تھی لیکن جب نیاز احمد کا نام آیا تو وہ چوکنا ہوگیا۔

"وہ پوجا پاٹھ کا کمرا ہے اور تم نے ایک مسلمان کو وہاں چھپا رکھا ہے۔ وہ بھی مورتیوں کے درمیان۔ اے بھگوان! نہ جانے اس گھور پاپ کی سزا ہمیں کیا ملے۔"

اب کرشن چندر پر یہ راز کھلا کہ نیاز احمد اس کے گھر میں موجود ہے۔ وہ اس وقت بھی مورتیوں کے درمیان بیٹھا ہوگا۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی کمرے میں جاکر نیاز احمد کو دیکھے لیکن اس کی ماں اتنی زور زور سے بول رہی تھی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سننے پر مجبور ہوگیا۔

"میں تم سے کہے دیتی ہوں اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

"انجام تو اس کا بھی اچھا نہیں ہوگا، اگر وہ پکڑا گیا۔"

"جیسے اس کے کرتوت ویسے اس کے پھل۔"

"اس کا کیا قصور جب راجا کی بہن ہی اس پر عاشق ہوگئی۔"

"اسے منع تو کر سکتا تھا۔ کہہ تو سکتا تھا تم ہندو میں مسلمان۔"

"محبت دھرم نہیں دیکھتی ہے۔"

"تم تو ناستک ہو۔ تم نے ایک مسلمان کو پناہ دی۔ تم تو آریہ سماجیوں سے بھی گئے گزرے ہوگئے۔"

"دوستی بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"اور دھرم کوئی چیز نہیں۔"

"دوستی بھی تو ایک دھرم ہے۔ دوستی خود ایک مذہب ہے" گوری شنکر نے بڑے دُلار سے کہا۔

باپ کی باتیں کرشن کے دل میں قطرہ قطرہ کرکے اترتی جارہی تھیں۔ اس کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا جارہا تھا کہ دوستی اور خلوص بذاتِ خود ایک دھرم ہے۔ یہ دوستی ہندو اور مسلمان میں بھی ہوسکتی ہے۔ مورتیوں کے کمرے میں کسی

مسلمان کے قدم رکھ دینے سے دھرم بھرشٹ نہیں ہوجاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے پتاجی ایک مسلمان کو کبھی وہاں نہیں چھپاتے۔ اس کے ساتھ ہی جابر حکمرانوں کا ظلم و ستم بھی اس کے دل میں جاگزیں ہوگیا جو محبت کرنے کے جرم میں کسی کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ تو دھرتی پر بھگوان بنے بیٹھے ہیں۔ اس نے راجا کے متعلق نفرت سے سوچا۔

ماں ابھی تک بڑبڑا رہی تھی لیکن اب اس کی آواز میں وہ طاقت نہیں رہی تھی۔

"تم اس مسلمان کو یہاں سے نکال دو پھر میں اکیس دن کی کتھا رکھوں گی۔ ہون کروں گی' بھوجن کراؤں گی۔"

"سب کچھ کرلینا۔ میں اس سے کہہ دوں گا' وہ چلا جائے گا۔"

گوری شنکر نے رفعِ شر کے لیے کہا اور پرمیشوری دیوی چپ ہوگئی۔

اگلے دن صبح جب اس کی والدہ نیاز احمد کے لیے چائے اور ناشتا لے کر پوجا کے کمرے میں گئی تو نیاز احمد کمرے میں موجود نہیں تھا۔ کمرے کے عقب کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ شاید نیاز احمد نے رات کی گفتگو سن لی تھی اور وہ فرار ہوگیا تھا۔

اسی دن قلعہ نما تھانے کی سیڑھیوں کے نیچے نیاز احمد کی لاش پائی گئی۔ کسی نے اسے مار کر اس کی لاش کے چار ٹکڑے کردیے تھے۔

یہ نیاز احمد کی دوستی کی انتہا تھی۔ اس نے اپنی جان دے دی لیکن گوری شنکر پر آنچ نہیں آنے دی۔

اس واقعے نے کرشن کی نوتعمیر شخصیت میں ایک باب کا اور اضافہ کردیا۔ اس نے اپنے دل میں عزم کیا کہ وہ باؤجی کے نقشِ قدم پر چلے گا اور دوستی کی ایسی ایسی کئی مثالیں قائم کرے گا۔

اس کا باپ اس کے لیے ہیرو تھا' آئیڈیل تھا۔ وہ چپکے چپکے ان کی تمام خصوصیات اپنے اندر سموتا جارہا تھا۔ حسن پرستی اور عشق' انسانیت کو دھرم سمجھنا' دوستی میں حد سے گزر جانا' انسان اور انسان کے درمیان ذات پات کی دیوار کھڑی نہ کرنا' خلوص' مہمان نوازی' مظلوم کی حمایت اور ایسے کتنے ہی سبق وہ اپنے باپ کی درس گاہ سے سیکھ رہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی' بڑی بڑی روشن چمکیلی آنکھیں' کالے گھنے بال اور درمیانہ قد اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ وہ محبوب بنائے گا بھی اور محبوب بنے گا بھی۔

نیاز احمد کے واقعے نے اسے بتادیا تھا کہ دوستی ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ دوستی کرنا اپنے آپ کو دوست کے حوالے کردینے کے مترادف ہے۔ دوستی بے غرض اور بے لوث ہوتی ہے۔ بہت سے دوست' بہت سی دولت ہوتی ہے۔

اس نے اسی جذبے کے تحت بہت جلد پورے اسکول کو اپنا دوست بنالیا۔ ان دوستوں کے ساتھ پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتے رہنے میں اسے لطف آنے لگا۔ جھرنوں اور چشموں کا شیریں ٹھنڈا پانی اس کے لیے آبِ حیات بن گیا۔ اس کی نت نئی شرارتیں' پُرخلوص جذبہ' دلچسپ باتیں ایسی مقبول ہوئیں کہ پورے اسکول میں اس کے نام کی جے ہونے لگی۔

درسی کتابوں سے اسے ویسے ہی رغبت نہیں تھی۔ کھیل کود میں پڑ کر اس طرف سے اور بھی غافل ہوگیا۔

رنگوں میں نہائے ہوئے ایسے ہی کسی موسم میں وہ اپنے والد کے ساتھ سید مظفر حسین شاہ' دیوان مال گزاری کے گھر گیا۔ یہ دنیا ہی اس کے لیے نئی تھی۔ مسلم معاشرے کی نہایت جوان روایات اس گھر میں موجود تھیں۔

"آداب عرض' جناب گوری شنکر صاحب۔"

"آداب عرض۔"

"مزاج بخیر؟"

"اللہ کا کرم ہے۔"

"یہ صاحب زادے ہیں؟"

"بڑا بیٹا ہے' کرشن چندر۔"

"ماشاء اللہ! خوب صورت بھی ہے اور ذہین بھی معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھے اس سے بڑی امیدیں ہیں لیکن پڑھنے میں اس کا دھیان ذرا کم ہی ہے۔"

"ذہین بچے اکثر اسکول سے نہیں بھاگتے لیکن کتابوں سے ضرور بھاگتے ہیں۔"

اس بات پر دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اتنی دیر میں ملازم حقہ تازہ کرکے لے آیا۔ گوری شنکر نے چند کش لیے اور حقہ مظفر حسین شاہ کی طرف بڑھادیا۔ باری باری ایک ہی حقے سے دونوں دوست کش لگا رہے تھے اور کرشن چندر حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ ہوتی ہے دوستی۔ اس وقت دو انسان بیٹھے ہیں جو آپس میں دوست ہیں۔ یہی ان کا ایمان ہے یہی دھرم۔

اس دوران میں دونوں دوستوں کے درمیان گفتگو بھی جاری تھی۔ اس گفتگو کا مرکز و محور انگریز... حکومت کا ناپسندیدہ اور قابلِ مذمت پہلو تھا۔

"کتنی شرم کی بات ہے کہ سات سمندر پار سے آکر ایک قوم ہم پر حکومت کررہی ہے۔"

"ہاں صاحب' جدھر دیکھو گورے ہی گورے سر اٹھا کر فرعونوں کی طرح چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

"ان کی انصاف پسندی کے بڑے چرچے ہیں مگر سوچنے

والے یہ نہیں سوچتے کہ ظلم کرنے والا منصف کیسے ہو سکتا ہے۔"

کرشن چندر نے پہلی بار انگریزوں کے بارے میں اتنی تفصیل سے باتیں سنی تھیں اور پہلی مرتبہ انگریزوں کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا احساس پیدا ہوا تھا۔

انگریزوں سے گزر کر بات مقامی حکمرانوں کے ظلم و جبر تک آگئی۔

کرشن چندر اس نتیجے پر پہنچا کہ ظالم تو ظالم ہوتا ہے انگریز یا دیسی نہیں ہوتا۔ ظلم کہیں بھی ہو، اس کے خلاف لڑنا چاہیے۔

اسے اب تک راجاؤں کا چہرہ بہت پُرکشش، پُرشکوہ اور بڑا پُروقار لگتا تھا لیکن اس گفتگو کے بعد اس چہرے کا دوسرا رخ نمایاں ہوگیا جو بہت گھناؤنا، بدنما اور قابلِ نفریں تھا۔

اسے یاد آیا، وہ ایک روز اپنے باپ کے ساتھ راجا بلدیو سنگھ کے محل میں گیا تھا۔ محل کی آرائش دیکھ کر وہ بہت مرعوب ہوا تھا۔ اس کے باپ راجا کے علاج کے لیے گئے تھے۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ وہاں دو راج کمار بھی تھے۔ کرشن ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔ راج کماروں نے اسے اپنی کچھ بیش قیمت چیزیں دکھائیں۔ کرشن کے پاس اس وقت اس کے آبائی شہر وزیرستان کا بنا ہوا چاقو تھا، اس نے وہ دکھایا۔ چاقو دیکھتے ہی دونوں راجکمار مچل گئے۔ ایک راجکمار نے چاقو اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ وہ اپنے چاقو کے لیے دونوں راجکماروں سے الجھ پڑا۔ وہ دو تھے اور یہ اکیلا۔ دونوں نے اس کا مار مار کے بھرکس نکال دیا۔ چاقو الگ اس کے ہاتھ سے گیا۔ یہ لوگ اسی طرح کرتے ہیں۔ بابوجی ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں کہ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ دوسروں کا مال مار مار کر ہی تو جاگیردار بنے ہیں۔

وہ اپنے خیالوں میں مست تھا کہ ملازم نے آکر نوید دی۔ کھانا چُنا جا چکا تھا۔

کھانے کے کمرے میں پہنچتے ہی اس کی بھوک چمکنے لگی۔ وسیع دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ ایسے کھانے جو اس کے گھر میں کبھی نہیں بنے تھے۔ یہ قورمہ ہے، یہ پلاؤ ہے، یہ بھنا گوشت ہے، یہ شاہی ٹکڑے ہیں، یہ فیرنی ہے۔ گوشت کو دیکھ کر اسے اچانک یاد آگیا کہ وہ ہندو ہے۔ ماتاجی ماس کھانے والوں کو بُرا سمجھتی ہیں۔ مجھے بھی منع کرتی ہیں۔ اس کے باپ کو اس کی کیفیت کا فوراً اندازہ ہوگیا۔

"تمہاری والدہ سناتن دھرمی ہیں مگر تمہیں نہیں ہونا چاہیے۔ تم اگر ان چکروں میں پڑ گئے تو ہرگز ترقی نہیں کرسکو گے۔ گھر جا کر کچھ مت بتانا مگر اس وقت تو کھالو۔"

تصنیفات

افسانوی مجموعے

۱۔ طلسم خیال ۲۔ نظارے ۳۔ ہوائی قلعے ۴۔ گھونگھٹ میں گوری جلے ۵۔ ٹوٹے ہوئے تارے ۶۔ زندگی کے موڑ پر ۷۔ نغمے کی موت ۸۔ پرانے خدا۔ ۹۔ ان داتا ۱۰۔ تین غنڈے ۱۱۔ ہم وحشی ہیں ۱۲۔ اجنتا سے آگے ۱۳۔ ایک گرجا ایک خندق ۱۴۔ سمندر دور ہے۔ ۱۵۔ شکست کے بعد ۱۶۔ نئے غلام ۱۷۔ میں انتظار کروں گا ۱۸۔ مزاحیہ افسانے ۱۹۔ ایک روپیہ ایک پھول ۲۰۔ یوکلپٹس کی ڈالی ۲۱۔ ہائیڈروجن بم کے بعد ۲۲۔ نئے افسانے ۲۳۔ کتاب کا کفن ۲۴۔ دل کسی کا دوست نہیں ۲۵۔ مسکرانے والیاں ۲۶۔ کرشن چندر کے افسانے ۲۷۔ سینو کا قیدی ۲۸۔ مس نینی تال ۲۹۔ دسواں پل ۳۰۔ گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو ۳۱۔ آدھے گھنٹے کا خدا ۳۲۔ الجھی لڑکی کالے بال۔

اس نے ڈرتے ڈرتے سالن میں ہاتھ ڈالا۔ مسالے دار گوشت جس میں لال مرچوں کی بہتات تھی، اسے اتنا پسند آیا کہ ذرا سی دیر میں چٹ کرگیا۔ پلاؤ کی خوشبو نے تو اسے دیوانہ کردیا۔ شاہی ٹکڑوں پر بھی خوب ہاتھ صاف کیا۔

کھانے پر مظفر شاہ کا بیٹا حسن شاہ بھی موجود تھا جس سے اس کی فوراً دوستی ہوگئی۔

کھانے سے فراغت کے بعد وہ اسی حویلی کا کتب خانہ دیکھنے حسن شاہ کے ساتھ گیا۔ ہزارہا کتابیں شیلفوں میں بڑے قرینے اور سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔

"باپ رے باپ! اتنی کتابیں۔ کون پڑھتا ہے انہیں؟"

"میں بھی پڑھتا ہوں، ابا حضور بھی۔"

"ہر طرح کی کتابیں ہیں؟"

"ہر طرح سے کیا مطلب؟"

"مثلاً ناول، افسانے وغیرہ؟"

"یہ سب ناول ہیں" حسن شاہ نے ایک طرف اشارہ کیا "اور اس طرف افسانے رکھے ہیں اور یہ داستانیں ہیں۔"

"حسن شاہ، ایک بات کہوں۔"

"کہو۔"

"کیا میں ان کتابوں کو پڑھ سکتا ہوں؟"

حسن شاہ تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا جواب دے۔ ابھی اتنی دوستی نہیں ہوئی تھی کہ فوراً تیار ہوجاتا۔

"اگر واپس کرنے کا وعدہ کرو تو۔"
"کتاب پڑھتے ہی واپس کردوں گا۔ دوسری کتاب بھی تو پڑھنی ہوگی۔"
"اس کے لیے بھی ابا حضور سے اجازت لینی ہوگی۔"
"یار، تم سفارش کردو۔ مجھے بہت شوق ہے ان کتابوں کا۔"
"ٹھہرو، میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں۔"
مظفر شاہ کی اس کے پتا سے جو دوستی تھی، اس رشتے سے یہ بعید تھا کہ وہ انکار کرتے۔ انہوں نے فوراً اجازت دے دی۔ حسن شاہ کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔
"کون سی کتاب دوں؟"
"کوئی ناول دے دو۔"
"یہ پڑھو" حسن شاہ نے سرشار کا ایک ناول نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔
اب اس کے لیے وہاں ٹھہرنا بے سود تھا لیکن باپ کے بغیر کیسے آسکتا تھا۔ اسے کچھ دیر اور رکنا پڑا۔
وہ گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں خزانہ بھی تھا، خزانے کی چابی بھی۔ یہ کتاب خزانہ تھی اور اس کتاب کو واپس کرکے وہ دوسری کتاب لاسکتا تھا۔ اسے اس وقت کتاب پڑھنے سے زیادہ یہ فکر تھی، وہ جلدی سے اسے ختم کرے تاکہ دوسری ملے۔
اس نے یہ ضخیم ناول صرف دو دن میں ختم کرلیا۔ اب اسے وہاں جانے کے لیے پتاجی کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہاں اس کا دوست حسن شاہ رہتا تھا۔
حسن شاہ کو کتابوں سے ایسی محبت تھی جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے سے کرتی ہے۔ کرشن چندر کے آنے سے زیادہ اسے یہ خوشی ہوئی کہ اس کی کتاب واپس آگئی تھی۔ اب اسے دوسری کتاب دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔
چند ملاقاتوں کے تکلف کے بعد حسن شاہ نے اپنے کتب خانے کا دروازہ اس پر کھول دیا۔ کرشن بلا تکلف اپنی پسندیدہ کتابیں وہاں سے لے آتا اور گھر پر ان کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں لوٹا دیتا۔
کچھ نادر اور نایاب نسخے ایسے بھی تھے جو تمام تر دوستی کے باوجود حسن شاہ دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ انہیں پڑھنے کے لیے اسے وہیں بیٹھنا پڑتا۔ اس قربت نے جہاں اس کے آتشِ علمی کو تیز کیا وہیں حسن شاہ سے دوستی بھی گہری ہوتی گئی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ گھر سے اسکول جانے کے لیے روانہ ہوتا اور حسن شاہ کے گھر پہنچ جاتا۔ حسن شاہ نے اسے بائبل پڑھائی، قرآن مجید اور رگ وید کا ترجمہ سنایا۔ کالی داس کا شہرۂ آفاق ڈراما، شکنتلا، شیکسپیئر کا ہیملٹ وغیرہ پڑھ کر سنائے۔
اس پاکیزہ ماحول میں اس کے ذوقِ ادب کو جلا ملی۔ اس گھر میں وہ کتابوں کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص تہذیب سے بھی واقف ہوا جس کی آگاہی کسی کتاب سے حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔
وہ اپنی دانست میں اچھا خاصا عالم بن چکا تھا لیکن نصابی کتب میں دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے وہ ابھی تک نالائق طالبِ علم تھا۔ اس کے ماسٹر بلاقی رام کا سلوک اب بھی پُر تشدد تھا۔
بلاقی رام کی مسلسل مار سے تنگ آکر اس نے ان کے خلاف ایک طنزیہ مضمون "پروفیسر بلیسکی" لکھا اور چپکے سے ہفتہ وار اخبار "ریاست" دہلی کو بھیج دیا۔
کثرت سے کتابیں پڑھنے کی وجہ سے اسے اپنے قلم پر اعتماد تو تھا لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ اس کا مضمون اخبار میں چھپ بھی جائے گا۔ اسی لیے اس نے کسی دوست کو ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ صرف عبداللہ تھا جو اس کے اس راز سے واقف تھا۔ عبداللہ، اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا برادر نسبتی تھا اسی لیے تمام اساتذہ اس کا خیال رکھتے تھے اور اسی لیے کرشن نے اسے اپنا دستِ راست بنایا ہوا تھا۔
عبداللہ روز اس سے پوچھتا رہا تھا کہ مضمون کا کیا ہوا۔ اب تو اسے یہ پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ اس نے عبداللہ کو بھی کیوں بتایا۔
وہ تقریباً مایوس ہوچکا تھا کہ ڈاکیے کی آمد نے اسے حیران کردیا۔ اخبار میں اس کا مضمون جوں کا توں چھپ گیا تھا۔
دوسرے دن وہ عبداللہ کو ایک گوشے میں لے گیا "مضمون چھپ گیا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اسے پھیلاؤ۔ پروفیسر بلیسکی کی آڑ میں بلاقی رام پر میں نے ایسی چوٹیں کی ہیں کہ بچو...کو مزہ آجائے گا۔"
عبداللہ کے لیے یہ کام کون سا مشکل تھا۔ اس نے یہ اخبار استادوں تک پہنچادیا۔ ایک دن تو عملے کے تمام ارکان اسے مزے لے لے کر پڑھتے رہے اور دوسرے دن پورے وکٹوریہ اسکول میں پروفیسر بلیسکی کی آوازیں آنے لگیں۔
"یار، تم بڑے چھپے رستم نکلے۔ مضمون تو ادیب لکھتے ہیں، تم تو ادیب ہو۔"
"اب دیکھنا میں کیسے کیسے مضامین لکھتا ہوں اور سب ریاست اخبار میں چھپیں گے۔ دوسرے اخبار والے مانگیں گے بھی تو نہیں دوں گا۔"
وہ کئی دن تک بڑے بڑے منصوبے بناتا رہا۔ کئی مضامین کے خاکے اس کے ذہن میں جمع ہوگئے جن پر اسے قلم اٹھانا تھا لیکن پھر ذہن میں بوس ہوگئے۔
مضمون کی ایسی شہرت ہوئی تھی کہ پورے علاقے میں

غلغلہ سا مچ گیا تھا۔ اس کے والد کو بھی علم ہو گیا۔
"کیوں جی، یہ مضمون آپ نے تصنیف کیا ہے؟" اس کے والد نے پوچھا۔
"جی!" اس نے اکڑ کر کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا پتاجی اسے شاباش دیں گے۔
"قلم اس لیے ہوتا ہے کہ اس سے اپنے بزرگوں کی پگڑیاں اچھالی جائیں؟ اگر اب میں نے دیکھ لیا کہ تم نے کوئی مضمون لکھا ہے تو میں نہ قلم ثابت چھوڑوں گا نہ تمہارے ہاتھ۔"
والد نے کچھ ایسے سخت الفاظ میں سرزنش کی اور اس کی مضمون نگاری کو نازیبا حرکت قرار دیا کہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ذہن میں ترتیب پانے والے مضامین کو پھاڑ کر پھینک دیا اور عہد کیا کہ آئندہ وہ کوئی مضمون نہیں لکھے گا۔
چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اس نے مضمون نگاری سے توبہ کی تھی، شاعری کا میدان کھلا پڑا تھا۔
اسکول میں سالانہ جلسہ تھا۔ راجا صاحب اس جلسے میں بطور خاص شریک ہوئے۔
اردو کے ماسٹر دینا ناتھ شاعر تھے اور شوق تخلص فرماتے تھے۔ انہوں نے راجا کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ اس قصیدے کی اتنی تعریف ہوئی، اتنی تالیاں بجیں کہ کرشن کو بھی ایسی کوئی چیز کہنے اور اپنی تعریف سننے کا اشتیاق ہوا۔
وہ کئی دن تک مختلف شاعروں کے دیوان پڑھتا رہا اور پھر اپنی ایک غزل لکھ لی۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے درست کس سے کرایا جائے۔ اسے اپنے ماسٹر دینا ناتھ کا خیال آیا کہ پونچھ بھر میں وہ ہی واحد شاعر تھے۔ بھری کلاس میں تو ایسی چیزیں دکھائی نہیں جا سکتی تھیں لہٰذا اس نے دروازے پر پڑی ہوئی چق اٹھائی اور ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا اور پھر وہ کاغذ ان کے سامنے رکھ دیا جس پر اشعار لکھے ہوئے تھے۔
"کیا ہے یہ؟"
"میں نے شاعری کی ہے۔ آپ بھی اسے دیکھ لیں۔"
"اچھا، تو آپ نے شاعری کی ہے" انہوں نے کہا اور اس کی اولین شعری کاوش کو جانچنے پرکھنے لگے۔
"یہ شعر ہیں؟" ماسٹر دینا ناتھ نے کہا۔
"اچھے ہیں نا؟"
"یہ شعر ہیں؟ انہیں تم شعر کہتے ہو۔ قافیہ کیا ہے، ردیف کدھر ہے، اور وزن!"
وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ایک چانٹا اس کے دائیں گال پر رسید کیا۔ وہ ابھی سنبھلا ہی تھا کہ دوسرا چانٹا بائیں گال پر پڑا۔
"مذاق سمجھا ہوا ہے شاعری کو۔ مجھے جتانے آیا ہے کہ میں ایسی شاعری کرتا ہوں۔ میں بلاقی رام نہیں ہوں جس پر تو نے مضمون لکھا تھا۔ نکل جا میرے کمرے سے۔ چلے آتے ہیں شاعر کہیں کے۔"
یہ حادثہ اس کے لیے بڑا اچانک اور نہایت غیر متوقع تھا۔ وہ خاموشی سے چلا آیا۔
یہ بات یہیں رہ جاتی تو بھی غنیمت تھا لیکن دینا ناتھ نے بھری کلاس میں اسے کھڑا کر دیا اور اس کے شعروں کا اس طرح ہنس ہنس کر مذاق اڑایا کہ اس نے زندگی بھر کے لیے شاعری سے توبہ کر لی۔
"دینا ناتھ نہیں چاہتے کہ پونچھ میں ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر پیدا ہو۔ اسی لیے انہوں نے میری شاعری کا مذاق اڑایا۔ خیر، اگر وہ یہی چاہتے ہیں تو یہی سہی، میں آئندہ شاعری نہیں کروں گا۔"
اس نے اپنی بہترین شاعری کو بدترین قرار دیے جانے کا یہ جواز پیش کیا اور شاعری سے توبہ کر لی۔
اب اس کی ساری توجہ کرکٹ میچوں کی طرف ہو گئی۔ جوبلی ہائی اسکول کے میچ اکثر مسلم ہائی اسکول سے ہوتے رہتے تھے۔ اس نے ان میچوں میں اتنا نام پیدا کیا کہ اپنی ٹیم کی ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا۔
اس کے دوست بے انتہا تھے۔ اسکول میں بھی اسکول سے باہر بھی۔ راجکماروں تک سے اس کی دوستی تھی جن کے ساتھ وہ گرمیوں کی دوپہریں ڈاک بنگلے کے آرام دہ کمروں میں گزارتا تھا۔
ہاکی، فٹ بال، گھڑ سواری، موسیقی اور مصوری کون سا ایسا شوق تھا جس سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ ان دلچسپیوں نے رخ بدلا اور ڈرامے اس کی جان بن گئے۔ پونچھ میں ہونے والا شاید ہی کوئی ڈراما ہو جو اس نے نہ دیکھا ہو۔ اسکول میں ہونے والے ایک ڈرامے میں اس نے خود بھی ارجن کا پارٹ کیا۔
یہ شوق اور نہ جانے کیا رنگ دکھاتا کہ دسویں کے امتحان سر پر آ گئے۔ اس کے ساتھی کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ کھیلوں کے میدان خالی ہو گئے۔ اسے بھی مجبوراً کتابیں کھولنی پڑیں۔
جس طرح لڑکیاں طاقوں میں گڑیاں چھوڑ کر پی کے گھر سدھار جاتی ہیں، اسے بھی میٹرک کرتے ہی مینڈر اور پونچھ کی ساری دلچسپیاں چھوڑ کر لاہور جانا پڑا۔
اب گھر کے آنگن میں اس کے دوسرے بہن بھائی بھی

آگئے تھے لیکن اس کی ماں کو کرشن کی ایک پل کی جدائی بھی گوارا نہیں تھی۔ جب سے انہوں نے سنا تھا کہ وہ پڑھنے کے لیے لاہور جائے گا ان کا رو رو کر بُرا حال تھا لیکن بیٹے کا مستقبل بھی عزیز تھا۔ اسے روک بھی نہیں سکتی تھیں۔ یہ سہارا بھی انہیں سہارا دیے ہوئے تھا کہ لاہور میں کرشن کے تایا رہتے ہیں۔ وہ ان کی نگرانی میں رہے گا۔

وہ لاہور کیا آیا ایک نئی دنیا میں آگیا۔ پونچھ کے مقابلے میں یہاں کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی۔ پونچھ کی معصومیت یہاں تک پہنچتے پہنچتے شباب کی منزلوں میں داخل ہوگئی تھی۔ کالجوں اور باغوں کا شہر اس اعتبار سے اس کے لیے نیا نہیں تھا کہ اس نے اپنے بچپن کے کچھ دن یہاں گزارے تھے لیکن اب میں اور جب میں بہت فرق آگیا تھا۔ اب لاہور بھی بدل گیا تھا' اس کا بچپن بھی شباب کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا۔

اس کے پتا اسے چھوڑنے آئے تھے اور آتے ہی اس کے داخلے کے لیے کوشش کرنے لگے تھے۔ وہ مصر تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ڈاکٹر بنے جبکہ خود اسے سائنس کے مضامین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن باپ کی ضد کے آگے اسے مجبور ہونا پڑا۔ گوری شنکر نے اسے فارمین کرسچین کالج میں ایف۔ ایس۔ سی (میڈیکل) میں داخلہ دلادیا۔

گوری شنکر تو کچھ دن رہنے کے بعد واپس چلے گئے اور وہ اپنے تایا کے گھر چوک متی میں رہائش پذیر ہوگئے۔

باپ کے جاتے ہی اس نے آنکھ کھول کر لاہور کو دیکھا۔ ادب اور سیاست کا مرکز لاہور' اس کے سامنے دسترخوان کی طرح بچھا ہوا تھا۔

انقلابِ روس نے اشتراکیت پسند طبقے کو پیدا کردیا تھا۔ نوجوان طبقہ اشتراکی خیالات سے بے حد متاثر ہورہا تھا۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو مٹا کر ایک ایسے نظام کو رواج دینے کی باتیں ہورہی تھیں جو اقتصادی برابری' اخوت اور امن و صلح پر یقین رکھتا ہو۔ کالج پہنچتے ہی اسے اشتراکی خیالات سے شرابور نوجوان ملنے لگے۔

کرشن چندر ایک ایسی ریاست سے لاہور آیا تھا جہاں اس نے آنکھ کھولتے ہی دل دہلا دینے والی غربت دیکھی تھی۔ محنت کش طبقے کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں تھی اور اہلِ ثروت' ریاست کو اپنی جاگیر سمجھ کر دندناتے پھرتے تھے۔ اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کی زبانیں کھینچ لی جاتی تھیں۔

ایسا نامنصفانہ اور انسانیت کش ماحول سے اشتراکیت نے بے تحاشا اپنی طرف کھینچ لیا۔

اس کی شخصیت میں اس کے باپ کی شخصیت بھی گھل مل گئی تھی۔ اس کے باپ رجعت پسندانہ خیالات کو لایعنی سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بھگوان کے وجود کے بھی منکر تھے۔ ذات پات اور چھوت چھات سے نفرت کرتے تھے۔ یہی وہ خیالات تھے جو اشتراکیت سے عبارت تھے۔ ان خیالات کو جب اس نے مرتب شکل میں اور ایک تحریک کی صورت میں دیکھا تو وہ ان کی طرف جھکتا چلا گیا۔

سائمن کمیشن کی آمد آمد تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی' مہاتما گاندھی کی قیادت میں کمیشن کا بائیکاٹ کرچکی تھی۔ ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس نکالا گیا جس کی قیادت لالہ لاجپت رائے کررہے تھے۔

لاکھوں افراد کا مجمع لاہور ریلوے اسٹیشن کے باہر کمیشن کے ارکان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس ہجوم میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کرشن چندر بھی موجود تھا اور چلا چلا کر "سائمن گو بیک" کے نعرے لگا رہا تھا۔

کمیشن کے ارکان جونہی گاڑی سے اترے' نعروں میں شدت آگئی۔ بپھرے ہوئے جلوس کو سنبھالنا مشکل ہورہا تھا۔ کمیشن کے ارکان پولیس کے نرغے میں اسٹیشن سے باہر نکلنا چاہتے تھے لیکن بے قابو جلوس راستہ دینے پر تیار نہیں تھا۔ انگریز پولیس افسر نے لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ لاٹھیوں کی بارش شروع ہوگئی۔

کرشن چندر جوشِ غضب میں جلوس کے اگلے حصے میں پہنچ چکا تھا۔ بھگدڑ مچی تو وہ بھی چونکا ہوا لیکن اتنی دیر میں لاٹھی کا ایک بھرپور وار اس کے کاندھے پر پڑا۔ وہ چیختا ہوا جلوس کی پچھلی جانب بھاگا۔ لاٹھیاں یہاں بھی برس رہی تھیں۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ اس نے بھی دوڑنا شروع کردیا اور موچی دروازے تک دوڑتا چلا گیا۔

قدم رُکے تو کاندھے کی تکلیف کا احساس ہوا۔ وہ پیدل چلتا ہوا ایک باغ میں پہنچ گیا۔ اب اسے اپنی بزدلی کا شدت سے احساس ہورہا تھا۔ مجھے بھاگنا نہیں چاہیے تھا' اس نے اپنا کاندھا سہلاتے ہوئے کہا۔ اگر سب اسی طرح بھاگ گئے تو آزادی کا یہ سفر کیسے طے ہوگا۔ مجھے ان لاٹھیوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ حب الوطنی کا یہی تقاضا ہے۔ وہ باغ سے نکلا اور اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ لوگ ابھی تک واپس آرہے تھے' اسٹیشن کی طرف جانے والا اس کے سوا کوئی نہیں تھا پھر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ بکھرا ہوا جلوس اب جلسے کی شکل میں احتجاج کرے گا۔ موری گیٹ پر جہاں وہ اس وقت موجود تھا جلسہ ہوگا۔ لالہ لاجپت رائے خطاب کریں گے۔ اب آگے بڑھنا بے کار تھا۔ وہ پھر موری گیٹ کے باغ میں آکر بیٹھ گیا اور جلسہ جمنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اب یہ فخر تھا کہ

اس نے وطن کی آزادی کی خاطر لاٹھی کھائی ہے۔ اس کا اس جلسے میں شریک ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ گھر بھی نہیں گیا اور جلسہ شروع ہونے تک وہیں بیٹھا رہا۔

لالہ لاجپت رائے شعلہ بیان مقرر تھے۔ شیر پنجاب کہلاتے تھے۔ انہوں نے وہ شعلے برسائے کہ دلوں میں آگ لگ گئی۔ نوجوان کرشن چندر کے دل میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف باغیانہ جذبات نے جگہ بنالی' بدیسی حکومت سے نجات حاصل کرنے کا آتشیں جذبہ پیدا کردیا۔

وہ جلسہ ختم ہونے کے بعد چوک متی' اپنے گھر کی طرف آیا تو مکمل اشتراکی بن چکا تھا۔ یہ عقیدہ پختہ ہوگیا اس کے غریب ہندوستان کا علاج اشتراکیت میں پوشیدہ ہے۔ آج کے واقعے سے اسے یہ بھی یقین آگیا تھا کہ ہمیں سیاسی آزادی کی نہیں' ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ انقلاب اور باغیانہ خیالات کا طوفان اس کے دل میں دھومیں مچانے لگا۔ اب کوئی طاقت نہیں تھی جو اسے اشتراکیوں سے عملی تعاون کرنے سے روک سکتی۔ اس کا فطری اور جبلی رجحان بھی اسی طرف تھا۔

مشہورِ زمانہ انقلاب پسند بھگت سنگھ انقلابی تحریک چلا رہے تھے۔ یہ شخص برٹش حکومت کے لیے چھلاوا بنا ہوا تھا۔ نوجوانوں کے لیے اس کے عزائم میں بڑی کشش تھی۔ یہ نوجوان جوق در جوق انقلابی پارٹی میں شریک ہو رہے تھے۔ اس خفیہ تحریک کا اثر کالج میں بھی تھا۔ بھگت سنگھ کی انقلابی پارٹی کے بہت سے طلبہ کالج میں تھے۔ کرشن ان سے واقف تھا لیکن اس نے باقاعدہ پارٹی جوائن نہیں کی تھی۔

سائمن کمیشن کے خلاف ہونے والے جلسے میں شرکت کے بعد اس کے دل میں انقلاب کی آگ دہکنے لگی تھی۔

کالج ہوسٹل کے ایک کمرے میں انقلابی تحریک کا کام بڑی رازداری سے کیا جارہا تھا۔ ایک دن وہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ ان لڑکوں کے خیالات اور ان کی جوشیلی باتیں سن کر اس کا خون گرم ہوگیا۔

رات کے اندھیرے میں چوک متی سے ہاسٹل تک آنا آسان نہیں تھا۔ جی کڑا کرکے آبھی جاتا تو گھر پر کیا بہانہ کرتا۔ اس کا ایک ہی علاج تھا۔ وہ تایا کے گھر سے ہاسٹل منتقل ہوگیا۔ رات کے اندھیرے میں انقلابی لٹریچر تقسیم کیا جاتا تھا۔

اس نے پہلی مرتبہ ڈان برین کی معرکہ خیز انقلابی کتاب "مائی فائٹ فار آئرش فریڈم اور ویرے ورکر کی "انڈیاز فرسٹ وار آف انڈی پینڈنس" پڑھیں۔ کچا ذہن باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

ایف۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد سائنس سے اس کا دل بھر گیا۔ اس نے اپنے فطری رجحان کے مطابق بی۔ اے میں داخلہ لے لیا اور سیاست' تاریخ' ادب کے مضامین لیے۔

وہ بی۔ اے کے دوسرے سال میں تھا۔ ملک میں قومی تحریک نے ایک واضح صورت اختیار کرلی تھی۔ آنے والی آزادی کے نشان دھندلے دھندلے سہی لیکن نمودار ہونے لگے تھے۔ بھگت سنگھ کی کارروائیاں تیز سے تیز تر ہونے لگی تھیں۔ بھگت سنگھ تخریبی سرگرمیوں کے لیے دستے تشکیل دے رہے تھے۔ وہ بھی کالج سے بھاگ کر بھگت سنگھ کے گروہ میں شامل ہوگیا۔

کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ ہاسٹل سے بھاگ گیا ہے۔

کسی کے وہم وخیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کا رابطہ بھگت سنگھ کے خطرناک گروہ سے ہوسکتا ہے۔ سب گھر والے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ کہیں چلا گیا ہے۔

اس کی ماں کی تو جان ہی اس میں تھی۔ بچے اور بھی تھے لیکن کرشن پر وہ جان چھڑکتی تھی۔ وہ فوراً پونچھ سے لاہور آگئی۔

سب اسے ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے لیکن اسے کسی پر بھروسا نہیں تھا۔ کیا خبر کوئی ڈھونڈ بھی رہا ہے یا نہیں۔ وہ خود اسے ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ دیوانوں کی طرح ہر جگہ دوڑتی پھر رہی تھی۔ تھک ہار کر لوٹ آتی تو گھر میں ٹہلتی رہتی۔ میرا کاکا کہاں ہوگا۔ کس حال میں ہوگا۔ کہاں کھانا کھاتا ہوگا۔ اسے تو کھانے کا بہت شوق ہے۔

ناول

شکست' جب کھیت جاگے' طوفان کی کلیاں' دل کی وادیاں سوگئیں' آسمان روشن ہے' باون پتے' ایک گدھے کی سرگزشت' ایک عورت ہزار دیوانے' غدار' سڑک واپس جاتی ہے' دادر پل کے بچے' برف کے پھول' بورن کلب' میری یادوں کے چنار' گدھے کی واپسی' چاندی کے گھاؤ' ایک گدھا نیفا میں' ہانگ کانگ کی حسینہ' مٹی کے صنم' ایک وائلن سمندر کے کنارے' درد کی لہر' لندن کے سات رنگ' کاغذ کی ناؤ' پانچ لوفر' پانچ لوفر ایک ہیروئن' گنگا بہے نہ رات' دوسری برف باری سے پہلے' گوالیار کا حجام' بمبئی کی شام' چندا کی چاندنی' ایک کروڑ کی بوتل' مہارانی' پیار کی ایک خوشبو (ماخوذ)' مشینوں کا شہر' کارنیوال' آئینے اکیلے ہیں' چنبل کی چنبیلی' اس کا بدن میرا چمن' محبت بھی قیامت بھی' سونے کا سنسار' سپنوں کی وادی' آدھا راستہ' ہونولولو کا راجکمار' فٹ پاتھ کے فرشتے' آدھے سفر کی پوری کہانی (ہندی)

اب اسے اچھا کھانا کہاں مل رہا ہوگا۔
گھر والوں کو یہ فکر ہونے لگی تھی کہ کہیں وہ کرشن کے غم میں پاگل نہ ہوجائے کہ ایک دن کرشن واپس آگیا۔
یہ ملاپ عارضی ثابت ہوا کیونکہ گھر پہنچتے ہی پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔
وہ لاہور کے قلعے میں نظربند تھا اور اس سے تفتیش ہورہی تھی۔ وہ نظربندی دو ماہ تک جاری رہی۔ تفتیش کے دوران میں کوئی ثبوت ایسا نہیں ملا جو اسے مجرم ثابت کرتا لہٰذا اسے رہا کرنا پڑا۔ وہ کچھ دن کے لیے پونچھ چلا گیا۔

○☆○

وسندھرا نام کی ایک لڑکی اس کے بچپن کی ساتھی تھی۔ عمر میں اس سے بڑی تھی لیکن دونوں کی خوب بنتی تھی۔ اب کرشن ہی نہیں وہ بھی جوان ہوگئی تھی۔ جوانی سب پر آتی ہے مگر اس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ وہ قتالۂ اب قتالۂ عالم بن گئی تھی۔ ایسی خوب صورت نکلی تھی کہ اس کے حسن و جمال کے چرچے گھر گھر ہونے لگے تھے۔ وہ جدھر سے گزر جاتی، اس کے قدموں میں آنکھیں بچھ جاتیں۔
کرشن اپنی رہائی کے بعد پونچھ آیا تو اس نے بھی یہ قصے سنے۔ اسے اپنے بچپن کی بھولی بسری کئی کہانیاں ایک ساتھ یاد آگئیں۔ وہ کتنی شوخ تھی۔ مجھ سے کتنا دلار کرتی تھی۔ پیار ہی پیار میں کتنا چھیڑتی تھی۔ شاید مجھے چاہتی بھی تھی۔ میں بھی اسے چاہنے لگا تھا لیکن اس وقت اظہار کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ نہر پر جہاں اور لڑکیاں بھی نہاتی تھیں، وسندھرا مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ وہ جل پری کی طرح پانی میں تیرتی تھی۔ سنہرے بال، دراز قامت، پانی میں آگ لگاتی تھی۔ اب تو قیامت ہوگئی ہوگی۔
عشق نام کا جو جذبہ اب تک اس کے دل میں چھپا ہوا تھا اور جس کا اسے احساس ہی نہیں تھا، اچانک سر اٹھانے لگا۔ اسے ایک نظر دیکھنا تو چاہیے۔ اسے بھی تو معلوم ہو کہ اس کا کرشنا آگیا ہے۔
بچپن کی آزادی، شباب کی پابندیوں کی نذر ہوچکی تھی۔ اب دونوں کا ملنا آسان نہیں تھا اور وسندھرا تو یوں بھی فخر و ناز کے زیور سے آراستہ تھی اس لیے گھر سے کم ہی نکلتی تھی۔ کرشن کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ کسی ایسے ذریعے کی تلاش میں تھا جو وسندھرا سے ملاقات کا وسیلہ بن جائے۔ اندھیرے میں جگنو کی طرح گوربخش سنگھ کا نام چمکا۔ وہ کرشن کا دوست بھی تھا اور وسندھرا کا دور کا رشتے دار بھی۔ وہ اس ملاقات کا اہتمام کرسکتا تھا۔ اس نے گوربخش سنگھ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔
"اس سے ملنے کا اب کیا فائدہ۔ اس نے تو تمہیں بھلا بھی دیا ہوگا۔ اب تو ریاست کا راجکمار تک اس کے شیدائیوں میں ہے، وہ تم سے کیوں ملے گی؟" گوربخش نے کہا۔
"بچپن، بچپن ہوتا ہے گوربخش سنگھ۔ وہ میرا بچپن بھولی نہیں ہوگی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا پہلا عشق تھے۔ پہلا عشق کوئی نہیں بھولتا۔"
"کیا کروگے اس سے مل کر؟"
"ایک نظر دیکھوں گا۔"
"پھر؟"
"پھر دوبارہ دیکھنے کی آرزو میں عمر گزار دوں گا۔"
"لاہور جاکر خوب باتیں آگئی ہیں۔ اگر ایسی ہی باتیں کیں تو ممکن ہے وہ تم پر نچھاور ہوجائے" گوربخش نے کہا
"اچھا، میں کچھ کرتا ہوں۔"
گوربخش نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ایک تقریب میں اس نے وسندھرا کو مدعو کرلیا۔
ان دنوں بہترین انگریزی لباس پہننے کا اسے خبط سا تھا۔ وہ خوش لباس تھا اور اس وقت تو ایک ایسی تقریب میں جارہا تھا جہاں وسندھرا بھی تھی۔ اس نے بہترین سوٹ زیب تن کیا، شاندار ٹائی باندھی اور خوشبو میں نہا کر تقریب میں پہنچ گیا۔
وہ بھی عجیب روح پرور نظارہ تھا جب وہ دونوں روبرو ہوئے۔ وہ گھر سے کیا کیا سوچ کر آیا تھا لیکن اب گونگوں کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ رعب حسن نے اس کی زبان بند کردی تھی۔ آخر وسندھرا نے ہی پہل کی۔
"ارے کنّے (کرشن) بچپن میں تیرے گال پر یہاں ایک گڑھا پڑتا تھا" وسندھرا نے اس کے گال پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے کہا "وہ گڑھا کیا ہوا؟"
کرشن کے گال پر کسی نے جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وسندھرا نے اس کے بچپن کو یاد رکھا تھا۔ اسے یاد تھا کہ گال میں گڑھا پڑتا تھا۔ اسے اتنی چھوٹی سی بات بھی یاد ہے۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔
پھر وہ اس کی گھبراہٹ پر بے اختیار ہنسنے لگی "تم تو اب تک اسی طرح جھینپتے ہو۔"
وہ اس ریمارک پر اور جھینپ گیا۔ اسی وقت وسندھرا کو کسی نے آواز دی اور وہ معذرت کرکے آگے بڑھ گئی۔

گوربخش جو دور کھڑا دونوں کی ملاقات کا منظر دیکھ رہا تھا' دوڑا ہوا آیا۔
"کیا باتیں ہوئیں؟"
"مجھ سے تو کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ بس وہی بول رہی تھی۔"
"کمال ہے' تم نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ خیر' اب بھی بہت وقت ہے۔ تم بات ضرور کرنا۔"
اس تقریب میں کئی مواقع آئے جب وہ آمنے سامنے ہوئے لیکن وہ یہی سوچتا رہا کہ اس کو دیکھے یا اس سے بات کرے۔
وہ اس کی انگلی کی تپش اپنے گالوں پر محسوس کرتا ہوا گھر چلا آیا۔ اس کے گال میں تو اب گڑھا نہیں پڑتا تھا لیکن دل میں ایک گڑھا ضرور پڑ گیا۔ اس گڑھے میں اس نے وسندھرا کی انگلی کو محفوظ کر لیا جو بہت دن تک اندھیری راتوں میں اُجالا بن کر چمکتی رہی۔
بی۔ اے کرنے کے بعد اس نے ذوقِ ادب کی تسکین کے لیے ایم۔ اے انگریزی ادب میں داخلہ لے لیا۔
ادب و شعر سے اس کا پہلا تعارف حسن شاہ کے کتب خانے میں ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے تھے۔ ان سے نبرد آزما ہونے میں اسے اتنی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی کہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کوئی عملی کوشش کرتا' اسکول کے زمانے میں اپنے اسکول ماسٹر پر طنزیہ مضمون لکھنے اور باپ کی ڈانٹ سننے کے بعد اسے یہ جرأت نہیں ہو سکی تھی کہ قلم اٹھاتا لیکن ادب کی چنگاری اس کے دل میں جل ضرور رہی تھی۔ ایم اے (ادب) میں داخلہ لینے کے بعد یہ چنگاری بھڑکنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔
وہ ایم۔ اے کا امتحان دینے کے بعد میینڈر گیا ہوا تھا کہ اسے یرقان ہو گیا۔ مرض اتنا طول کھینچ گیا کہ وہ بستر سے لگ گیا۔ ان دنوں کتابیں پڑھنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں تھا۔
وہ بہت دیر سے اپنے کمرے میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت کوئی کتاب بھی قریب نہیں تھی کہ اٹھا کر دیکھ لیتا۔ وہ بستر سے اٹھا اور چہل قدمی کے انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے قدم زمین سے اوپر اٹھنے لگے ہیں۔ پہلے اس نے سوچا کمزوری کی وجہ سے چکر آ رہے ہیں لیکن پھر یوں لگا جیسے وہ خواب کی حالت میں ہے اس کا ذہن اس سے بچھڑ کر کہیں دور چلا گیا ہے۔ وہ گھبرا کے بستر پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سامنے کشمیر جنت نظیر کے رنگین' حسین' دلفریب مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ کہسار' مرغزار' آبشار' چنار۔ چشمے' جھرنے' جھیلیں' کشمیری دوشیزائیں جن کے رخساروں پر کشمیری سیبوں کی سرخی تھی۔ جن کے گھنے سیاہ بال گھٹاؤں کی طرح دن میں اندھیرا کر رہے تھے۔ زعفران کے کھیت انہیں دیکھ کر شرما رہے تھے۔ یہ دوشیزائیں گیت گا رہی تھیں۔ فراق کے گیت' وصال کے گیت' حسن و جمال کے گیت ترشے ہوئے بدن' کھلتے ہوئے چمن۔
ایک لڑکی چشمے کے قریب کھڑی ہے۔ پانی کا گھڑا اس کے قریب رکھا ہے۔ وہ اپنے پریمی کی منتظر ہے جو آئے اور گھڑا اس کے سر پر رکھ دے۔ پریمی آ گیا۔ اس نے گھڑا اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ گھڑے سے پانی رس رس کر لڑکی کے گلابی گالوں پر بہہ رہا ہے۔ سنہری بدن کی لہراتی چھایا سے اس کا پریمی دم بخود ہے....
"بھائی' لو یہ سوپ پی لو" اس کی بہن سرلا دیوی کمرے میں آ کر اس کی محویت کو توڑتے ہوئے بولی۔
"یہ سوپ یہاں رکھ دو" کرشن نے کہا "اور سب سے کہہ دینا کوئی اس کمرے میں نہ آئے۔"
"کیوں؟"
"بس کہہ دیا نا۔ کوئی یہاں نہ آئے' میں کچھ سوچ رہا ہوں۔"
اس نے مزید احتیاط کے لیے کمرا اندر سے بند کر لیا۔ اس نے ان واقعات کو پھر سے دہرانا شروع کر دیا۔ یہ تو وہی مناظر' وہی حقیقی مشاہدات ہیں جن کو وہ دیکھ چکا ہے' جن سے وہ گزر چکا ہے۔ یہ مناظر' یہ واقعات اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر یلغار کیوں کی ہے۔ کیوں نہ میں ان یادداشتوں کو کاغذ پر منتقل کر لوں۔ اس نے قلم اٹھایا اور سوچنے لگا کیا لکھوں' وہ خود وہیں بیٹھا رہ گیا۔ اس کا ذہن کمرے سے باہر نکل گیا۔ زعفران کے کھیت سیبوں کے باغ اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ اسے وہ فلمیں یاد آ گئیں جو اس نے قیام لاہور کے دوران میں دیکھی تھیں۔ ان فلموں میں یہ کھیت' یہ مناظر کہانی کے پس منظر میں ہوتے ہیں۔ دو کردار محبت کرتے ہیں' سماج رکاوٹ بنتا ہے اور اکثر یہ عشق ناکام ہو جاتے ہیں۔ اسے بھی تاراں' وسندھرا اور کئی لڑکیاں یاد آ گئیں۔ اگر وہ بھی کوئی کہانی لکھے' اس نے سوچا۔ کئی خیال ذہن میں آئے بالآخر ایک خیال نے اس کے قدم

پکڑ لیے۔ اس نے قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کردیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے مسلسل لکھنے کے بعد اس پر یہ عقدہ کھلا کہ اس نے تو افسانہ لکھ دیا ہے۔ یہ ایک رومانی افسانہ تھا۔ انفرادیت سے قریب اجتماعیت سے دور۔ سماجی تلخیوں کا ہلکا سا احساس لیکن انفرادی دکھ درد کا بھرپور شاہ کار۔ تخیل، رعنائی اور تازگی۔

اس نے اس افسانے کا عنوان ''یرقان'' رکھا۔ یہ اس کی زندگی کا اولین افسانہ تھا۔

اس وقت کئی ملک گیر شہرت کے ادبی جرائد مثلاً ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، ادبِ لطیف، نیرنگِ خیال، عالمگیر وغیرہ اپنے عروج پر تھے۔ ان رسائل میں ''ادبی دنیا'' اپنے مدیر کی پرکشش شخصیت کی وجہ سے ادیبوں میں خاص طور پر مقبول تھا۔ مولانا صلاح الدین ادب شناس اور ادیب ساز تھے اور نئے ادیبوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ کسی ادیب کا ادبی دنیا میں شائع ہونا ہی اس کے معتبر ہونے کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ کرشن نے بھی اپنے اس افسانے کو ''ادبی دنیا'' میں بھیج دیا۔

اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی جب ادبی دنیا کے مدیر نے اس کے افسانے کو نہ صرف شائع کیا بلکہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''اس افسانے کا شمار دنیا کے بہترین افسانوں میں کیا جاسکتا ہے۔''

ہر بڑے فنکار کی طرح اسے بھی اپنی صلاحیتوں پر یقین نہیں تھا۔ پہلا ہی افسانہ اتنے بڑے رسالے میں شائع ہوگیا۔ یہ اعزاز تھا لیکن اسے شک ہو رہا تھا کہ شاید اتفاق سے اتنا اچھا افسانہ لکھ لیا گیا۔ وہ ایسا افسانہ اب نہیں لکھ سکے گا۔ اس نے ایک افسانہ ''مصور کی محبت'' اور لکھا تو اسے کچھ کچھ یقین آنے لگا کہ وہ لکھ سکتا ہے۔

وہ لاہور واپس آیا تو چائے خانوں میں، رسائل کے دفاتر میں اس کے افسانے ''یرقان'' کی باتیں ہو رہی تھیں۔ افسانہ نگاروں کی اس کھیپ میں جو اس وقت رسائل میں نظر آ رہی تھی، اس کے ایک ہی افسانے نے اسے سب سے بلند کردیا تھا اور جب رسالہ ''ہمایوں'' کے مدیر میاں بشیر احمد نے اس کے بارے میں یہ تحریر کیا ''عمر اور تجربے کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد یہ شخص اردو کا مایہ ناز ادیب ثابت ہوگا۔'' تو وہ راتوں رات ایک مستند ادیب بن گیا۔

○☆○

اس نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے پاس کرلیا تھا۔ اس کی والدہ کا اصرار تھا کہ وہ ایل ایل بی کا امتحان پاس کرکے وکالت کا پیشہ اختیار کرے کیونکہ ان کے نزدیک یہ بڑا پُروقار اور باعزت پیشہ ہے۔ اسے نہ آگے تعلیم جاری رکھنے سے دلچسپی تھی نہ وکالت کے پیشے سے لیکن والدہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس نے لا کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔

اس کا چھوٹا بھائی مہندر ناتھ ہندو ہوسٹل میں رہتا تھا۔

یہ ہوسٹل نہایت بوسیدہ اور خستہ حال عمارت میں تھا اور لاہور کا سب سے سستا اور غلیظ ہوسٹل سمجھا جاتا تھا۔ کرشن جیسا حُسن پرست ایسی عمارت میں رہنا کبھی گوارا نہ کرتا لیکن کچھ بھائی کی محبت اور کچھ پیسے بچانے کے خیال نے اسے یہاں آنے پر مجبور کردیا۔ اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ شخص کنہیا لال کپور یہاں موجود تھا۔ یہ ایسی دلچسپ باتیں کرتا تھا کہ کرشن کا دل یہاں لگ گیا۔ کرشن بھی کچھ کم محفل باز نہیں تھا۔ اس کے آتے ہی ہندو ہوسٹل میں رونق سی آگئی۔

''یار، تم لوگ اس بور زندگی سے اکتا نہیں جاتے؟''

''اکتا جاتے ہیں'' کنہیا لال کپور نے کہا۔

''کیسے دل بہلاتے ہو؟''

''میں تو دیواروں کے پلستر کو دیکھ کر دل بہلاتا ہوں کہ آج کتنے انچ پلستر زمین پر گر گیا اور مہندر مجھے اس حال میں دیکھ کر دل بہلاتا ہے۔''

''آج سے یہ مصنوعی طریقہ ختم'' کرشن نے کہا ''اب اس ہندو ہوسٹل میں قوالیوں کی آوازیں گونجیں گی کیونکہ یہ ہوسٹل اپنی خستہ حالی میں کسی مزار سے کم نہیں ہے۔ اس نے اقبال کا کلام قوالی کے انداز میں چھیڑ دیا۔ کنہیا لال کپور نے اس کی آواز میں آواز ملائی اور دیکھتے ہی دیکھتے قوالی کی محفل گرم ہوگئی۔ بیچ بیچ میں قہقہے بھی چلتے رہے اور ایک نہ ایک شریکِ محفل اٹھ کر ناچتا بھی رہا۔

''یار، اس طرح تو ہمارے گلے بالکل قوالوں کی طرح ہوجائیں گے۔ مزہ تو جب ہے کہ کوئی اور گا رہا ہو اور ہم مزے سے بیٹھے سُن رہے ہوں۔''

''ابے، یہاں مجرا کرایا تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ آس پاس گھر ہیں۔''

''اس کا انتظام کرنا ہماری نہیں، محلے والوں کی ذمّے داری ہے۔''

''کیا پڑوسی یہاں آکر ناچیں گے؟''

''یہ میں تمھیں کل بتاؤں گا'' کرشن نے کہا۔

دوسرے دن کرشن کہیں سے گراموفون اٹھا کر لے آیا

''اب یہ گائے گا اور ہم سنیں گے۔''

''تم تو کہہ رہے تھے، یہ محلے والوں کی ذمّے داری

ہے۔"

"میں نے کیا غلط کہا تھا۔ یہ گراموفون میں محلے والوں سے مانگ کر لایا ہوں۔ ایک پڑوسی کو ہماری حالت پر رحم آ گیا ہے۔"

"دن، رات یہ بھونکتا رہے گا تو ہم پڑھیں گے کس وقت۔"

"بھئی مجھے تو پڑھنے سے کوئی دلچسپی ہے نہیں" کرشن نے کہا "میں تمہاری خاطر اتنا کر سکتا ہوں کہ جتنی دیر تم پڑھنے میں مصروف رہو گے، میں افسانہ لکھتا رہوں گا۔ جب تم پڑھتے پڑھتے تھک جاؤ تو مجھے بتا دیا کرنا۔ میں گراموفون چلا دوں گا۔"

یہ رعایت اس نے دے تو دی تھی لیکن اس پر عمل اس کے بس کا نہیں تھا۔

ان دنوں اس میں خود اعتمادی کی اتنی کمی تھی کہ جب تک اپنا لکھا کسی کو سنا نہیں لیتا، اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ کسی قابل ہے بھی یا نہیں لہٰذا جب وہ کوئی افسانہ مکمل کرتا، دوڑا ہوا آتا۔

"ایک افسانہ ہوا ہے۔ تم اسے سن کر اپنی رائے دو۔"

"بھئی، مجھے کچھ نوٹس تیار کرنے ہیں۔ میں کتاب پڑھ رہا ہوں۔ دیکھ نہیں رہے ہو۔" کپور نے کہا۔

"تمہاری یہ کتاب، میرے افسانے سے بڑھ کر نہیں ہے" وہ اس کے ہاتھ سے کتاب چھینتے ہوئے کہتا۔

"اچھا سناؤ۔"

وہ افسانہ سناتا۔ پھر دیر تک اس پر باتیں ہوتی رہتیں، کپور کی کتاب دھری رہ جاتی۔

"بھئی، میں تو اب کچھ فراغت چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے، کچھ دیر گراموفون سن لیا جائے۔"

ساری سنجیدگی رخصت ہو جاتی۔ ہلا گلا شروع ہو جاتا کہ دل بہلانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

کنہیا لال کپور ڈی اے وی کالج میں پروفیسر تھا۔ ابھی اس نے مزاح نگاری میں قدم نہیں رکھا تھا لیکن ادب پر گہری نظر تھی لہٰذا وہ کرشن کا بہترین سامع اور رہنما بنا ہوا تھا۔

کرشن کی ادبی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ لاہور کے ادبی حلقوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا بڑھتا جا رہا تھا۔ ترقی پسند ادیب اور شعرا اسے ایک قابلِ ذکر ادیب ماننے لگے تھے۔

اس کی ملاقات پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں سے ہوئی جو مشہور سوشلسٹ تھے۔ دونوں نے طے کیا کہ سوشلزم کے پرچار کے لیے ہفتہ وار اخبار جاری کیا جائے لہٰذا ضروری تیاری کے بعد ہفتہ وار پرچا "دی نارورن ریویو" کے نام سے نکالنا شروع کر دیا۔ ترقی پسند ادیب فیض احمد فیض اور ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور دوسرے ساتھی باقاعدگی سے اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

وہ سوشلسٹ پارٹی سے منسلک ہو گیا تھا۔ اپنی ذہانت، خلوص اور عملی قوت سے بہت جلد پارٹی میں اعتبار پیدا کر لیا۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ بھنگیوں کی انجمن کا صدر بھی منتخب ہو گیا۔ باقاعدگی سے ان کی بستیوں میں جاتا۔ ان کی میٹنگز کرتا، ان کے مسائل کو سمجھنے اور انہیں سلجھانے کے لیے سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتا اور پھر ان مشاہدات کو اپنے افسانوں میں لکھ دیتا گویا یہ زندگی اس کے افسانوں کے لیے خام مواد فراہم کر رہی تھی۔

اب اس کی مصروفیات میں افسانہ نگاری، بھنگیوں کی سیاست اور کنہیا لال کے ساتھ تقریباً ہر روز کوئی رومانی فلم دیکھنا شامل تھا۔

مال روڈ پر واقع پلازا سینما میں مشہور زمانہ فلم "رومیو اور جولیٹ" دکھائی جا رہی تھی۔ کرشن چندر اور کنہیا لال کپور، رات کے دوسرے شو میں اس فلم کو دیکھنے گئے۔

گلابی جاڑے کی آمد آمد تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ دونوں دوست فلم کا شو ختم ہونے کے بعد ہوسٹل کی طرف آ رہے تھے۔ فلم ایسی مسحور کن تھی کہ سحر اب تک نہیں ٹوٹا تھا۔ کرشن ابھی تک فلم کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مزے لے لے کر فلم کی تعریفیں کر رہا تھا۔

"آپ تو ترقی پسند ادیب ہیں اور یہ ایک رومانیت میں ڈوبی ہوئی فلم۔ پھر آپ اس کی مدح سرائی کیوں کر رہے ہیں؟" اچانک کنہیا لال کپور نے سوال کیا۔

"ہر ترقی پسند ادیب نفاست پسند اور حسن پرست ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اتنی حسین بن جائے جیسی یہ فلم تھی" کرشن چندر نے مسکرا کر جواب دیا۔

یہ بات اسی وقت ختم ہو گئی لیکن کنہیا لال کپور کا طنز کرشن کے ذہن میں برابر گونجتا رہا۔ ہوسٹل میں آنے کے بعد بھی وہ برابر غور کرتا رہا۔ وہ سوچتا رہا کہ واقعی کپور کی بات میں کتنی صداقت ہے۔ میں اپنے خیالات میں ترقی پسند ہوں لیکن میرے افسانے رومان پرور ہیں۔ میں اپنے فن میں رومان نگار ہوں۔ میرے افسانوں میں جمال پرستی، تخیل پرستی اور ماورائیت پائی جاتی ہے۔ ایک خواب ناک فضا ہے جس میں عشق کی جولانیاں اپنا رنگ جماتی ہیں۔ ایک شاعرانہ زبان ہے جو سراسر رومانوی ہے۔ ترقی پسندی کا تقاضا یہ ہے

کہ گردوپیش کی دھڑکتی ہوئی زندگی کی عکاسی کی جائے جس کا تعلق حیاتِ انسانی اور اس کے مسائل سے ہو۔ زندگی کی حرکت، حرارت اور ارضیت کو بیان کیے بغیر ترقی پسندی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ پھر اس نے ترقی پسندی کے نام پر لکھے جانے والے ادب کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہاں زندگی کے مسائل تو تھے لیکن بے جان اور بے رنگ۔ رومان کو شعوری طور پر نکال کر پھینک دیا گیا تھا۔ دوسری طرف رومان نگار افسانہ نگار تھے جنہوں نے زندگی کے مسائل کو نکال باہر کیا تھا۔ اس نے سوچا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ رومان اور حقیقت نگاری کو ملا دیا جائے۔ عشق دکھایا جائے لیکن ان سماجی عوامل کا بھی ذکر ہو جو اس عشق میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ سرمایہ دار کس طرح دولت کے بل پر کسی کی جوانی خرید لیتا ہے اور ہیرو اس لیے ناکام رہتا ہے کہ وہ نادار ہے۔ اسی طرح افسانے کی زبان میں شادابی اور رعنائی قائم رکھ کر رومان کا تاثر برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ رومان اور حقیقت کے امتزاج سے ایک نئی چیز پیدا ہوگی۔

قلم سے واپسی پر ہونے والی معمولی سی بات نے اس کی راہ میں کئی چراغ جلا دیے۔ اس کی فنی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ اس نے ترقی پسندوں کی حقیقت نگاری کو رومانی حقیقت نگاری بنا دیا۔ اس نے اپنے آئندہ افسانوں میں صرف دھان کے کھیتوں کو بیان نہیں کیا بلکہ ان کھیتوں میں کھڑے ہوئے بھوکے کسان کا سراپا بھی بیان کیا۔

یہ رومانی حقیقت نگاری کرشن چندر کی عطا تھی جو اس نے اردو ادب کو دی۔ وہ اس کا موجد تھا۔ اس انداز کے افسانے اسے منفرد بناتے رہے اور وہ مشہور ہوتا چلا گیا۔

اس نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کر لیا تھا لیکن وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اب وہ بطور ادیب اتنا مشہور ہو چکا تھا کہ اپنی باقی زندگی ادب کی خدمت کرتے ہوئے صرف کر دے لیکن فی الوقت سوال ذریعۂ معاش کا تھا۔

وہ سخت ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ وکالت اختیار کرے یا ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ اس نے ادب کے حق میں فیصلہ سنا دیا تھا لیکن تلاشِ معاش میں پریشان تھا۔

کنہیا لال کپور کے توسط سے اسے ایک پبلشر کے ہاں ملازمت مل گئی۔ روزانہ آٹھ دس گھنٹے کی ریاضت کے بعد ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھے ہوئے تھا لیکن کام کی یکسانیت سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔

یہ ملازمت چھوڑنے کے بعد اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ افسانے لکھ رہا تھا۔ انشائیے اور چند ڈرامے بھی لکھ کر چھپوا چکا تھا۔ اس نے سوچا ادیب بننا ہے تو ادب میں ایک ڈگری اور لے لی جائے۔ وہ علامہ اقبال پر تھیسس لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں بہت سارا مواد بھی اکٹھا کر لیا تھا، بس اجازت ملنے کی دیر تھی۔

اس نے ایک روز کنہیا لال کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر محمد اقبال، صدرِ شعبہ فارسی کے پاس پہنچ گیا جو اتفاق سے علامہ اقبال کے ہم نام تھے اور جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

"ریسرچ کے معنی ہوتے ہیں گم شدہ کی تلاش۔ اقبال کے متعلق ایسے کون سے واقعات ہیں جن کو آپ تلاش کرنا چاہتے ہیں" صدرِ شعبہ فارسی نے عجیب طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"میرا موضوع ہوگا، اقبال بہ حیثیت شاعر" کرشن نے کہا۔

"اس پر تو آپ سے پہلے بہت سے لوگ لکھ چکے ہیں۔"

"میں اپنے نقطۂ نظر سے لکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ فرمائیں، آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟"

"اقبال فطرتاً ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔" کرشن نے کہا۔

"انہوں نے کبھی اپنے ترقی پسند ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

"فرق کیوں نہیں پڑتا۔ یہ تو وہی بات ہوئی، مدعی ست گواہ چست۔"

"بعض اوقات شاعر اپنی عظمت سے واقف نہیں ہوتا۔ آپ شیکسپیئر کی مثال لے لیجیے۔"

"یک نہ شد دو شد! آپ نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ اقبال اپنی عظمت سے واقف نہیں۔" صدرِ شعبہ نے اعتراض کیا۔

"خود اقبال نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔"

"کہاں؟"

"ان کا یہ مصرع تو آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔"

"وہ تو شاعرانہ بات ہے" صدرِ شعبہ نے کہا "خیر، آپ یہ بتائیے کہ آپ کی فارسی کی استعداد کتنی ہے۔"

"خاصی ہے۔"

"خاصی سے کام نہیں چلے گا۔"

"کیا آپ کو صرف یہی اعتراض ہے" کرشن نے

جھنجلا کر کہا۔

"یہ بھی ہے لیکن سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ اقبال ابھی زندہ ہیں اور ہم کسی زندہ شخص پر تھیسس لکھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

اب یہ تو وہ نہیں کر سکتا تھا کہ پہلے اقبال کو مارتا اور پھر ان پر تھیسس لکھنے بیٹھتا۔ وہ کسی اور پر لکھ سکتا تھا مگر کیوں لکھتا؟ جس پر وہ لکھنا چاہتا تھا اس کے ساتھ یہ شرط کیوں کہ پہلے اسے مرنا چاہیے۔ وہ اس مردہ پرست ذہنیت پر کڑھتا ہوا چلا آیا۔

کچھ دنوں تک وہ یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتا رہا کہ اچھا ہی ہوا ورنہ میں کسی کالج کا پروفیسر بن کر رہ جاتا۔ میں ادب پڑھانے کے لیے نہیں، ادب لکھنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ وہ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد مزید شد و مد سے ادب کی تخلیق میں مشغول ہو گیا۔

○☆○

انجمن ترقی پسند مصنّفین کا پہلا حلقہ ۱۹۳۵ء میں چند ہندوستانی طلبہ نے لندن میں قائم کیا تھا۔ اس میں سجاد ظہیر پیش پیش تھے۔ جب وہ لندن سے ہندوستان آئے تو انہوں نے ترقی پسند مصنّفین کی ایک انجمن بنانے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لیے لکھنؤ میں ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد کی اور انجمن کی بنیاد رکھی۔

اس انجمن میں جو تقاریر ہوئیں اور جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ترقی پسند مصنّفین سرمایہ داری، جاگیرداری اور ظلم کے سامراجی گروہ کے خلاف ہیں اور جمہوری طاقت کے حق میں ہیں۔ ان مصنّفین کا مقصد ادب کو رُجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے۔ ادب کو عوام کے قریب لانا ہے۔ زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی وغیرہ کو بیان کرنا ہے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی ادبی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ وہ ادیب جو پہلے سے ایسا ادب تخلیق کر رہے تھے، ان کے ہاتھ ایک پلیٹ فارم آگیا۔ ہر شہر میں ترقی پسندوں کی انجمنیں قائم ہو گئیں، ہر نیا ادیب ترقی پسند کہلانے کا مشتاق نظر آنے لگا۔

کرشن چندر کا میلان شروع ہی سے اشتراکیت کی جانب تھا۔ اس نے ریاست پونچھ میں دل دہلا دینے والی غربت دیکھی تھی۔ اس کا علاج وہ اشتراکی نظام میں ڈھونڈتا رہا تھا۔ ترقی پسندی کے اعلان نامے میں اشتراکیت کا لفظ استعمال نہیں ہوا تھا لیکن خیالات وہی تھے۔ کرشن کی تشفی اس انجمن کی شمولیت ہی سے ہو سکتی تھی لہٰذا وہ پنجاب کی انجمن کے سرگرمی سے کام کرنے لگا۔ بہ حیثیت ادیب بھی اب اس کی اتنی شہرت ہو گئی تھی کہ وہ انجمن کا ایک مؤثر رکن سمجھا جانے لگا اور بہت جلد اسے انجمن کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔

۱۹۳۸ء میں ترقی پسند کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی جس میں کرشن نے پنجاب کے ادیبوں کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی اور یہاں کے ادب کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

اس سے اگلے سال اس کا پہلا افسانوی مجموعہ "طلسم خیال" شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت نے اس کی شہرت کو پَر لگا دیے۔ کئی معتبر ادیبوں نے تبصرہ کرتے ہوئے اسے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کیا۔

وہ نئے افسانہ نگاروں کا قافلہ سالار تسلیم کیا جانے لگا تھا لیکن خود اس کا حال یہ تھا کہ بے کاری کے دن گزار رہا تھا۔ اسے بہترین لباس پہننے کا شوق تھا، قرینے کی زندگی گزارنے کی آرزو تھی لیکن وہ تو دوستوں کی مدارات کرنے سے بھی عاجز تھا، شاندار زندگی کیسے گزارتا۔ وہ ایسے ملک کا ادیب تھا جہاں ادب سے روٹی نہیں کمائی جا سکتی۔ کسی معقول ملازمت کا دور دور تک نشان نہیں ملتا تھا۔ بے کاری کے دن یوں تو بڑے مزے کے تھے کہ تخلیقی سفر کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ لاہور کے وہ تمام ہوٹل جو ادیبوں کے دم سے آباد تھے، اس کی موجودگی سے رونق کدہ بنے ہوئے تھے، ادبی سرگرمیوں میں اس کی بدولت جان سی پڑی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھا۔ بہترین سوٹ پر شاندار نکٹائی باندھ کر ادیبوں کے درمیان بیٹھتا تھا لیکن اسے ماں جی کا خیال آتا تھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی فکر ستاتی تھی، ماں جی کے دل میں کتنے ارمان ہوں گے۔ میں ایک بھی پورا نہ کر سکا۔

لاہور میں نیا نیا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تھا۔ ادیبوں کے لیے ریڈیو کی ملازمت میں بڑی کشش تھی۔ اسے ہاتھ بڑھانا نہیں پڑا۔ اس کی شہرت نے خود اس کا انتخاب کیا۔ اسے "پروگرام اسسٹنٹ" کے طور پر ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ یہ ایسی پیش کش تھی کہ اس شام وہ کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھا تو دوستوں نے اسے مبارک بادیں دیں لیکن وہ خود بجھا بجھا تھا۔

وہ سخت ذہنی تذبذب کا شکار تھا۔ اس کے جو خیالات تھے اور جس مقصد کے لیے وہ جنگ کر رہا تھا، جابر انگریز حکومت کی ملازمت اس کے برعکس تھی۔ یہ ملازمت اختیار کرنا اس کے لیے باعثِ ننگ تھا۔ ایک طرف اس کے

تصورات تھے دوسری جانب معاش۔ وہ کئی دن اس دوراہے پر کھڑا، دائیں اور بائیں دیکھتا رہا۔ پھر وہ کھڑے کھڑے تھک گیا، مجبور ہوگیا۔ ضمیر میں کانٹا کھٹکتا رہا۔ اس نے اس کھٹک کو برداشت کرلیا اور یہ ملازمت قبول کرلی لیکن اس عزم کے ساتھ کہ وہ اپنے تصورات کو مرنے نہیں دے گا اور جب موقع ملے گا اس پنجرے کو توڑ کر اڑ جائے گا۔ ادیبوں کو جیل بھی تو ہوجاتی ہے، میں بھی اس قفس میں چند دن گزار لوں۔

اس کی ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کا براہِ راست تعلق اردو ادب سے تھا۔ افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری سے تھا۔ ریڈیو کا ماحول بھی اس کے حسبِ منشا تھا۔ چوٹی کے ادیب اور شاعر یہاں ہر وقت موجود رہتے تھے اس لیے اس کا جی لگ گیا۔ اس کا قلم رواں دواں رہا۔ یہ ملازمت اس کے نظریات پر پہرے نہیں بٹھا سکی۔

اس کی ماں دوسری بہت سی ماؤں کی طرح نہ جانے کب سے اس کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو مند تھی۔ ملازمت کی نوید ملتے ہی اس نے اس کے لیے لڑکی بھی دیکھ لی اور چٹ منگنی کی نوبت آنے سے پہلے ہی پٹ بیاہ ہوگیا۔

ودیا وتی نام کی ایک لڑکی اس کی پتنی بن کر اس کی زندگی میں آگئی۔

وہ ایک جمال پرست ادیب تھا۔ ودیا وتی کو جب اس نے اس نظر سے دیکھا تو اس میں کوئی جسمانی کشش اور جاذبیت نظر نہیں آئی۔ اس نے اس کمی کو بھی ماں کی پسند سمجھ کر گوارا کرلیا اور یہ سوچ لیا کہ اصل حسن تو خدمت اور محبت میں ہوتا ہے۔ یہ بیوی بن کر میری خدمت کرے گی، مجھ سے محبت کرے گی، میری ضرورتوں کا خیال رکھے گی۔ بس یہی میرے لیے بہت ہے۔ اس نے ودیا وتی کو بیوی کے طور پر قبول کرلیا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں، جب تک گھر کا انتظام ودیا وتی نے نہیں سنبھالا تھا، سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ کرشن اپنے فطری اخلاص کی بدولت ودیاوتی کی دلداری میں مصروف تھا لیکن جیسے ہی ودیا وتی نے گھر کا انتظام سنبھالا، کرشن کو لگا جیسے اس عورت میں کوئی گڑبڑ ہے۔

”ودیا، ذرا جلدی سے چائے تو بنادو۔ کچھ دوست آگئے ہیں۔“

”یہ کوئی وقت ہے دوستوں کے آنے کا۔“

”دوستوں کے لیے دروازے ہر وقت کھلے ہوتے ہیں۔“

”پہلے کی بات اور تھی۔ اب اس گھر میں آپ کی بیوی بھی آگئی ہے۔“

”اب تو یہ دوست اور زیادہ آئیں گے کیونکہ تم ان کی بھابی بھی تو ہو۔ اب ان کا زیادہ حق ہے اس گھر پر۔“

”بنائے دیتی ہوں لیکن روز روز ایسا نہیں چلے گا۔“

”اچھا بابا، نہیں چلے گا۔ اب تو بنادو بڑھیا سی چائے۔ بس چار کپ۔“

کرشن دوستوں کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ چائے کا پوچھنے اندر آیا۔ ودیا وتی ابھی رسوئی میں تھی۔

”بن گئی چائے۔“

”بن گئی۔“

”ارے بھئی تو لے آئیں۔ وہاں پردے کا کون ہے۔“

”اب تو یہ بات کہی ہے، آئندہ نہ کہیے گا۔ میں کسی کے سامنے آنے والی نہیں۔“

”نہ آؤ، چائے تو دو۔“ کرشن نے ٹرے میں رکھی ہوئی چائے کو دیکھا ”تم سے کتنی بار کہا ہے مہمانوں کے سامنے خالی چائے نہیں رکھتے۔“

”گھر میں کچھ نہیں ہے۔“

”خشک میوہ نہیں رکھا ہے؟“

”گھر میں تو پتا نہیں کیا، کیا ہے۔ سب رکھ دوں ان کے آگے۔“

کرشن نے اپنے ہاتھ سے میوہ نکالا اور چائے کے ساتھ دوستوں کے پاس لے کر پہنچ گیا۔

رات گئے دوست رخصت ہوئے تو وہ ودیاوتی کے پاس پہنچا۔

”ابھی تک سوئی نہیں۔ بھئی ہمارا تو ایسا ہی ہے۔ نہ دن کی خبر ہے نہ رات کی۔ تم میرے انتظار میں مت جاگا کرو۔“

”میں بیوی ہوں، نوکرانی نہیں ہوں کہ کام کاج کرنے کے بعد اپنی کوٹھری میں سو رہوں۔ مجھے انتظار کرنا ہوتا ہے۔ اب آپ کا یہ فرض ہے کہ انتظار نہ کرایا کریں۔ میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں، آپ ایک رات بھی وقت پر گھر نہیں آئے ہیں۔“

”ودیا وتی! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرا کام، میری مصروفیات ایسی ہیں کہ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ میں ادیب ہوں کوئی عام آدمی نہیں کہ دفتر سے سیدھا گھر آجایا کروں۔“

”ادیبوں کے کیا بیوی بچے نہیں ہوتے۔ آپ کیا دنیا سے انوکھے ادیب ہیں۔“

”سب کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔ وہ بھی اسی وقت گھروں کو جاتے ہیں جس وقت میں آتا ہوں۔ تمہیں تو خوش ہونا

چاہیے کہ تمہارا پتی اتنا بڑا افسانہ نگار ہے۔ اسے دنیا جانتی ہے۔"

"یہی کرنا تھا تو شادی کیوں کی تھی؟"

"میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تم میری مجبوریوں کو سمجھو گی بھی نہیں۔"

"میں خوب سمجھ گئی ہوں۔ میں یہاں اکیلی پڑی رہتی ہوں اور تم باہر عیش کرتے ہو۔"

"اس وقت تم غصے میں ہو پھر بات کریں گے" کرشن نے جھگڑا چکانے کے لیے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

وہ یہ سمجھ کر ٹالتا رہا کہ ودیاوتی اپنی محبت میں یہ سب کچھ کرتی ہے، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔ گھر میں روز چخ چخ ہوتی تھی لیکن کرشن برداشت کرتا رہا۔ وہ زور سے بولتا بھی نہیں تھا کہ کہیں گھر والوں کو علم نہ ہو جائے۔

کرشن کی تمام مصالحانہ کوششیں ایک ایک کرکے دم توڑتی گئیں۔

ودیاوتی کے ساتھ اس کی شادی گویا دو متضاد طبیعتوں کا تصادم تھا۔ دونوں کے درمیان کوئی مطابقت نہیں تھی۔ کرشن ایک بلند پایہ ادیب تھا۔ ودیاوتی کو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اپنے شوہر کی تخلیقات کی عظمت سے قطعی ناواقف تھی۔ گھر سے باہر اس کے فن کا طوطی بولتا تھا جبکہ گھر میں اس کا کوئی مداح نہیں تھا۔ اس کی سیاسی اور سماجی سرگرمیاں ایسی تھیں کہ گھر سے باہر جانے اور واپس آنے کے اوقات متعین نہیں تھے۔

جبکہ اس کی بیوی کا اصرار کہ وہ ایک پابند اوقات دفتر کلرک کی طرح معینہ وقت پر گھر سے باہر جائے اور واپس آئے۔ گھر کا سودا سلف لائے۔

کرشن کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ آئے دن گھر پر دعوتیں ہوتی تھیں۔ ودیاوتی کو خندہ پیشانی سے دوستوں کی تواضع کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔

گھر کی گھٹی گھٹی فضا، ہر وقت کی تکرار اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

اس نے ہر شریف آدمی کی طرح اس کا ایک ہی حل نکالا کہ چپ سادھ لی۔ صبح ہوتے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔ اس ناسازگار ماحول نے اس کے فن پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔ گھر میں سکون تو درکنار، الگ بیٹھ کر لکھنے کی جگہ تک نہیں تھی جبکہ وہ تنہائی میں لکھنے کا عادی تھا۔ لکھتے وقت ودیاوتی ایک چائے کا کپ بنانے کی روادار نہیں تھی، دو میٹھے بول تو کیا بولتی۔ اپنے افسانے کی جھوٹی تعریف تک اپنی بیوی سے سننے کو اس کے کان ترستے رہتے تھے۔

اس نے پھر بھی ودیاوتی سے علیحدگی مناسب نہیں سمجھی کہ ماتاجی کو تکلیف پہنچے گی۔

یہ شب و روز تھے کہ اس کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ہو گیا۔

کرشن کو لاہور سے محبت نہیں، عشق تھا۔ اس شہر میں اس نے جوانی کے طوفانی دن گزارے تھے۔ یہیں وہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوا تھا۔ یہیں اس کا فن پروان چڑھا تھا۔ یہاں اس کے احباب تھے، وہ جرائد اور مدیران تھے جو اس کے لیے خضرِ راہ بنے ہوئے تھے۔ ان سب سے جدا ہونا اس جیسے حساس آدمی کے لیے آسان نہیں تھا لیکن اسے سفر اور تبدیلیوں سے بھی عشق تھا۔ تمام تر نفرتوں کے باوجود اسے نوکری عزیز بھی تھی۔

دہلی بذاتِ خود ادب و شعر کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں کی اپنی تاریخ اور دلچسپیاں تھیں۔ وہ ان دلچسپیوں کی تلاش میں نکلا اور دہلی پہنچ گیا اور تیس ہزاری کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔

یہ ایک پرانی طرز کا مکان تھا جس کے سامنے کھلا برآمدہ تھا۔ اس سے گزر کر ایک بڑا کمرا جو بہ یک وقت ڈرائنگ روم اور شب خوابی کے کمرے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے کے بازو میں ایک اور شب خوابی کا کمرا تھا جس سے ملحق باورچی خانہ اور اس کے عقب میں غسل خانہ تھا۔

آل انڈیا ریڈیو پر اس کی تقرری پطرس بخاری کی سفارش پر ہوئی تھی لیکن پُرلطف بات یہ تھی کہ اب تک پطرس سے بالمشافہ ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

ایک دن کرشن، دفتر کے کام سے فارغ ہونے کے بعد پیدل اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ کسی نے اپنی موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے بڑی کھرج دار آواز میں کہا۔

"آئیے کرشن چندر صاحب، آپ کو گھر چھوڑ آئیں۔"

کرشن کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ ہوں نہ ہوں یہ پطرس ہیں لیکن بجائے اس کے کہ وہ اظہارِ تشکر کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ جاتا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "نو، تھینک یو۔"

پطرس نے پھر اپنی پیش کش کو دہرایا۔ کرشن نے پھر اسی انداز میں انکار کر دیا۔

"نہیں صاحب! میں پیدل چلنے کا عادی ہوں۔ پیدل ہی جاؤں گا۔"

اس مرتبہ کرشن کی آواز میں قدرے غصہ تھا۔ پطرس

نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور موٹر آگے بڑھالی۔
موٹر جب خوب آگے چلی گئی تو اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ اس نے اپنے طرزِ عمل سے خواہ مخواہ پطرس صاحب کی ناراضی مول لی۔ وہ ڈائریکٹر جنرل ہیں اور میں معمولی پروگرام اسسٹنٹ، پھر وہ ایک اچھے ادیب بھی تو ہیں۔
دراصل کرشن کے اس وقت تک تین افسانوی مجموعے شائع ہوکر شہرتِ دوام حاصل کرچکے تھے۔ بڑے بڑے جغادری ادیبوں نے ان پر تعریفی تبصرے لکھے تھے۔ ریڈیو پر ہونے کی وجہ سے کئی خوشامدی ادیب اس کے آگے پیچھے بھی رہنے لگے تھے۔ نام و نمود کے نشے میں وہ ایسا مست رہنے لگا تھا کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔
اس پر شرمندگی کی کیفیت کئی دنوں تک طاری رہی اور پھر آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں کہہ کر اس نے اپنا فیصلہ خود کرلیا۔
یہ واقعہ ابھی تازہ تھا کہ اسے آؤٹ ڈور براڈکاسٹ کے لیے متھرا بھیجے جانے کا حکم نامہ ملا تاکہ وہ بھگوان کرشن کے یومِ ولادت پر مندروں میں جاکر وہاں کا آنکھوں دیکھا حال نشر کرے۔
یہ ایک خاصا مشکل اور ذمے داری کا کام تھا اور عموماً تجربہ کار اسٹاف کو ایسے کاموں کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ کرشن حیران تھا کہ اس جیسے ناتجربہ کار کو کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ اسے پطرس سے اپنی تلخ کلامی یاد آگئی۔ اس کے دل میں اس وسوسے نے سر ابھارا کہ پطرس نے جان بوجھ کر یہ مشکل کام اس کے سپرد کیا ہے تاکہ جب یہ کام بہ طریقِ احسن پورا نہ ہو تو پطرس اسے بہانہ بناکر ملازمت سے سبک دوش کردیں۔
اس نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنے عملے کو لے کر متھرا روانہ ہوگیا۔
وہ متھرا سے واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ پطرس خود ریڈیو اسٹیشن آکر اس کی کارکردگی کے بارے میں بات چیت کریں گے۔
اسے امید تھی کہ پطرس اس کی پیٹھ تھپ تھپائیں گے اور حوصلہ افزائی کریں گے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ پطرس نے متعلقہ عملے کے سامنے اس کی ڈانٹ ڈپٹ شروع کردی۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ پطرس اسے نکالنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس نے سوچا جب ملازمت سے برطرف ہونا ہی ہے تو میں بھی اُدھار کیوں رکھوں۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیے۔
پطرس کے لیے شاید یہ پہلا موقع ہوگا جب ان کا کوئی ماتحت ان سے اس طرح برابری سے بات کررہا ہو۔ کرشن نے تین سال سنسکرت پڑھی تھی۔ رامائن چھ بار پڑھی تھی۔ پھر یہ کہ یہ خود اس کے مذہب کی بات تھی۔ پطرس کے دلائل کے سامنے وہ ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔
یہ مباحثہ تقریباً پون گھنٹے چلتا رہا۔ اس کے بعد پطرس نے میٹنگ برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔
ابھی میٹنگ ختم ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ چپراسی آگیا۔
"پطرس صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔"
"مجھے! اب کیوں؟ کہاں بیٹھے ہیں۔"
"ایڈوانی (اسٹیشن ڈائریکٹر) صاحب کے کمرے میں۔"
"تم چلو' میں آتا ہوں۔"
اس نے دوستوں کو الوداعی نظر سے دیکھا بلکہ دل ہی دل میں نوکری ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کی دانست میں اب اسے اس کی گستاخی کی سزا ملنے والی تھی۔
وہ ڈرتے ڈرتے اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ پطرس اسے دیکھتے ہی آگے بڑھے اور اسے گلے لگالیا۔
"برخوردار' میں تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ تم اس امتحان میں کامیاب ہوئے" پطرس نے کہا۔ اس کی پیٹھ تھپکی اور اسے اپنے پاس کرسی پر بٹھایا۔
"دیکھو' مسٹر ایڈوانی" وہ ایڈوانی سے مخاطب ہوئے "تم آفس میں داخل ہوا کرو تو سب سے پہلے اس لڑکے کو سلام کیا کرو" پھر زیڈ اے بخاری سے مخاطب ہوکر کہا "اس لڑکے کے لچھن اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ ایک دن کچھ نہ کچھ ضرور کرگزرے گا۔"
کمرے میں ہونے والی باتیں کمرے سے باہر بھی آگئیں۔ جہاں کچھ لوگوں کو اس کی کامیابی پر خوشی ہوئی وہیں کچھ لوگوں کو حسد بھی پیدا ہوا۔ پطرس جو قطعی انگریز ٹائپ کے افسر تھے' اس طرح کسی کی تعریف کریں!
کرشن اپنے حاسدوں سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ اب نہایت احتیاط' فرض شناسی' لگن اور تندہی سے کام کررہا تھا۔
اس عہد کا ایک اور بڑا افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بمبئی میں فلمی صحافی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کچھ فلموں کی کہانیاں اور مکالمے بھی لکھ چکا تھا۔ اسے آل انڈیا ریڈیو' دہلی میں ملازمت کی پیش کش ہوئی تو وہ دہلی چلا آیا۔ یہاں اس کی ملازمت بطور ڈراما نگار عمل میں آئی تھی۔ اس سے پہلے اس نے ڈراما کبھی نہیں لکھا تھا لیکن فلمی دنیا میں رہنے کی وجہ سے ڈرامے کی تکنیک سے خوب واقف تھا۔

اس نے اپنا ٹائپ رائٹر اٹھایا، جس پر وہ افسانے لکھتا تھا اور بمبئی سے دہلی آگیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ مستقل قیام ہونے تک رہا کہاں جائے۔ کرشن کی دوست نوازی ضرب المثل بنی ہوئی تھی۔ اس کا مکان بے فکروں کا ٹھکانا بنا ہوا تھا۔ کوئی دوست شب گزار کر چلا جاتا۔ کوئی چار چار دن پڑا رہتا اور کرشن ہر ایک کی اس طرح خاطر تواضع کرتا رہتا کہ جیسے یہ دوست ناراض ہو کر چلا گیا تو بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔

منٹو نے بھی سوچا جب تک کوئی انتظام نہیں ہو جاتا، کرشن کے گھر جا کر رہا جائے۔

وہ شاہد احمد دہلوی سے ملنے ساقی کے دفتر گیا ہوا تھا۔ وہاں سے اٹھا تو سیدھا تیس ہزاری، کرشن کے گھر پہنچ گیا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد منٹو نے اپنے چھوٹے کوٹ کی جیب سے شراب کی بوتل نکالی "لو، شراب پیئو۔"

کرشن نے کبھی شراب چکھی بھی نہیں تھی لیکن یہ کہتے ہوئے اسے شرم آرہی تھی کہ وہ شراب نہیں پیتا۔ جواب میں منٹو کو یہی کہنا تھا کہ کمال ہے، ادیب ہو اور شراب نہیں پیتے۔

"گلاس منگواؤ۔ دیر ہو رہی ہے" منٹو نے حکم دیا۔

کرشن نے نہایت اطمینان سے دو گلاس منگوائے اور منٹو کے سامنے رکھ دیے۔ اب منٹو کو کیا خبر کہ وہ شراب نہیں پیتا ہے۔ اس نے دونوں گلاسوں میں شراب انڈیلنی شروع کردی۔

"تم کون سی شراب پیتے ہو؟" منٹو نے کہا۔

"برانڈی یا پھر کوئی اچھی سی انگریزی وہسکی" کرشن نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"کون سی انگریزی وہسکی" منٹو نے منہ بناتے ہوئے کہا "وہسکی انگریزی نہیں ہوتی، اسکاچ ہوتی ہے۔ سالے انگریز شراب تک تو کشید کر نہیں سکتے، ہندوستان پر حکومت کیا کریں گے۔"

کرشن نے کہیں سے ایک نام سنا ہوا تھا وہی دہرادیا "مجھے ہیگ پسند ہے۔"

"سب بکواس" منٹو بولا "سولن وہسکی نمبرا سب سے بہتر ....ہے جو اس وقت تم پی رہے ہو۔ ایک تو پیسے کم اور پھر مزے میں اور نشے میں ہیگ سے بہتر۔ آئندہ سے یہی پیا کرو، سمجھے؟"

"ٹھیک ہے، آئندہ سے ہیگ نہیں پیا کروں گا۔"

"اور ڈالوں؟" منٹو نے اس کے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو پہلے ہی ایک چوتھائی بھر چکا تھا۔

"تمہاری مرضی۔ اور ڈال دو" کرشن نے بے بسی سے کہا۔

"اچھا، تو پٹیالہ پیگ پیو گے۔"

"ہاں" کرشن نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ پٹیالہ پیگ کیا ہوتا ہے۔

"بھئی، بڑے پیاک ہو" منٹو نے کہا اور "پٹیالہ پیگ" اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔

کرشن کی عجیب حالت تھی۔ اسے یہ اعزاز تو مل رہا تھا کہ منٹو کے ساتھ بیٹھ کر پئے مگر پئے کیسے؟

پہلی مرتبہ پینے والے پر جو گزرتی ہے، اس پر بھی گزری۔ گھونٹ گھونٹ کر کے اس نے پورا گلاس بالآخر حلق میں انڈیل لیا۔ وہ اپنی جگہ جما بیٹھا تھا، اس کی آنکھیں ناچ رہی تھیں۔ کبھی بند ہو جاتیں کبھی کھل جاتیں۔ کبھی چیزیں سمٹ جاتیں کبھی پھیل جاتیں۔

یہ ایک پیگ ہی اس کے لیے میخانہ بن گیا۔ منٹو اس کی حالت دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اسی لیے اس نے دوسرے پیگ پر اصرار نہیں کیا بلکہ اپنے تجربے سے سمجھ گیا کہ کرشن کھلاڑی نہیں ہے۔

"سچ کہو پیارے، آج سے پہلے پی تھی؟"

"نہیں۔ میں نے آج تمہارا دل رکھنے کے لیے پہلی مرتبہ پی ہے" کرشن نے اقرار کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، اسی طرح دل رکھا کرو" منٹو نے کہا "لیکن شراب باقاعدگی سے پیا کرو۔"

منٹو کئی پیگ حلق سے اتار چکا تھا۔ پینے کے بعد وہ بڑی پُرلطف باتیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی کر رہا تھا۔ موضوع کرشن چندر تھا۔ وہ اسے شراب کے فائدے گنوا رہا تھا اور کرشن کسی سعادت مند شاگرد کی طرح سن رہا تھا۔

"گناہ کی لذت شراب میں ہے۔ ادب کی چاشنی شراب میں ہے۔ عورت کی رنگت شراب میں ہے۔ مکروہاتِ دنیا سے نجات شراب میں ہے۔ بھئی تم کب تک پنڈت بنے رہو گے۔ آخر تمہیں ادب تخلیق کرنا ہے۔ کوئی اسکول کے بچوں کو تو پڑھانا ہے نہیں۔ زندگی نہیں دیکھو گے، گناہ نہیں کرو گے، موت کے قریب نہیں جاؤ گے، غم کا مزہ نہیں چکھو گے، سولن وہسکی نمبرا نہیں پیو گے تو کیا تم خاک لکھو گے۔"

کرشن نے جہاں شراب پہلی مرتبہ پی تھی، وہیں یہ تجربہ بھی پہلی مرتبہ ہوا کہ ودیاوتی گھر میں تھی لیکن اسے محسوس

ہوا جیسے وہ گھر میں نہیں ہے۔ پہلے کوئی دوست گھر میں آتا تھا تو اس کا دل دھڑکتا ہی رہتا تھا کہ نہ جانے کب وہ ہنگامہ کھڑا کردے لیکن اس وقت اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ منٹو ٹھیک کہتا ہے کہ مکروہاتِ دنیا سے نجات شراب میں ہے۔ اسے ودیا وتی کے ساتھ مکروہات کا خیال آنے پر ہنسی آگئی۔

ودیا وتی کے نزدیک اس میں جو برائیاں تھیں، اس میں ایک برائی کا اور اضافہ ہوگیا۔ اس رات وہ اس سے خوب لڑی۔

"تم پہلے بھی پیتے ہوگے، تم نے آج تک مجھ سے چھپایا۔"

"یقین کرو، آج پہلی مرتبہ پی ہے۔ وہ بھی منٹو صاحب کا دل رکھنے کے لیے۔ تم ایک ادیب کی بیوی ہو۔ ادیبوں میں مے نوشی بُری بات نہیں سمجھی جاتی۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے ادیب کی بیوی بننے کا۔ کان کھول کر سن لو، اس گھر میں شراب نہیں چلے گی۔"

"اچھا بابا، اس وقت تو سوجاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔"

وہ سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن اس کا ذہن جاگ رہا تھا۔ عورت عورت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ پتا جی کی مے نوشی پر ماں جی لڑتی بھی تھیں لیکن ان کے لیے گلاس لاکر بھی رکھتی تھیں۔ وہ سرور میں آکر باتیں کرتے تھے تو ان سے باتیں بھی کرتی تھیں۔ ان کے آرام کا خیال رکھتی تھیں۔ ایک یہ ودیا وتی ہے۔ اس نے ودیا کی طرف دیکھا جو مزے سے آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اسے ودیا وتی کی شکایت مناسب معلوم ہوئی تھی لیکن اب وہ سوچ رہا تھا، وہ کتنا ہی لڑے کل وہ پھر شراب پیئے گا۔

اب اس کے لیے شراب پینا کون سی مشکل بات تھی۔ منٹو اسی کے ساتھ رہ رہا تھا جو چلتا پھرتا شراب خانہ تھا۔ دوسرے دن کچھ اور دوست بھی آگئے۔ پھر سب نے دیکھا کہ کرشن نشے میں اتنا بہک گیا کہ سر پر گلاس رکھ کر ناچنے لگا۔

اچھی بیوی نہ ملنے کا دکھ وہ شراب میں انڈیلتا رہا۔ انتہا پسند طبیعتوں کے لیے شراب بڑی جان لیوا چیز ہے۔ کرشن بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ وہ باقاعدگی سے پینے اور بہکنے لگا۔

آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت کرنے کے لیے جو ادیب و شاعر بھی دہلی آتا، کرشن اسے گھیر گھار کے اپنے گھر ضرور لے آتا۔ پھر پُرتکلف دعوتیں ہوتیں، ادبی مباحث ہوتے، خوش گپیاں ہوتیں، جام کھنکتے۔ ادیبوں کا ایک تانتا سا بندھا رہتا۔ ن م راشد، ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، ریوتی سرن شرما، جگن ناتھ آزاد، منٹو، ہنس راج رہبر، کون تھا جو ان محفلوں میں شریک نہیں ہورہا تھا۔

کرشن چندر کے اندر باغیانہ خیالات کی آگ اب بھی سُلگ رہی تھی۔ سرکاری ملازمت کی گھٹن کے باوجود اس نے اپنے نظریات کو مرنے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی تحریروں میں اب بھی سامراجیوں کے خلاف علَم بغاوت بلند کررہا تھا۔ کبھی اشاروں میں کبھی صاف لفظوں میں بہ بانگِ دہل یہ اعلان کررہا تھا کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑدو۔ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو وہ اب بھی اپنا موضوع بنارہا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ اس نے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود دہلی میں ایک اینٹی فاشسٹ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے پطرس سے اجازت لینی ضروری تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ پطرس اسے اجازت دے دیں گے لیکن انہوں نے اجازت دے دی۔

اس منصوبے میں اس کے معاون ہندی کے مشہور کوی "آگے" اور ناول نگار جتیندر تھے۔ کانفرنس نہایت کامیاب رہی لیکن وہ حکومت کی نظروں میں آگیا۔

اس کانفرنس کے بعد اس نے ایک اور منصوبہ بنایا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کا ایک کنونشن بلایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے ادب کا رخ کیا ہونا چاہیے۔ اس نے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے شاہد احمد دہلوی سے رجوع کیا۔

"کنوینر آپ ہوں گے۔"

"کنوینر تو آپ کو ہونا چاہیے" شاہد احمد دہلوی نے کہا "کیونکہ آپ کو اردو والے بھی جانتے ہیں، ہندی والے بھی جانتے ہیں۔"

"لیکن آپ غیر جانب دار ادیب ہیں اور حکومت کے ملازم بھی نہیں۔"

شاہد احمد دہلوی تیار ہوگئے۔ نام ان کا تھا کام کرشن کا تھا۔

دو ہفتے بعد ہندوستان بھر کے ادیب دہلی آنا شروع ہوگئے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی سو سے کم نہیں تھی۔

اتنے مہمانوں کی دیکھ بھال، روپوں کا بندوبست، اخراجات کا حساب کتاب، کوئی مذاق نہیں تھا لیکن کرشن نے تمام کام نہایت مستعدی سے انجام دیے۔ شاہد صاحب کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑا۔

ہارڈنگ لائبریری کے ہال میں دو دن تک شاندار جلسہ ہوا۔ دھواں دھار تقاریر ہوئیں، قراردادیں پاس ہوئیں۔

بعد میں معلوم ہوا' اس کامیابی میں ایک خفیہ ہاتھ پطرس کا بھی تھا۔ وہ کئی وجوہات سے کھلے عام ترقی پسندی کا اعلان نہیں کرتے تھے لیکن کرشن کا ساتھ دے رہے تھے۔

وہ چپکے چپکے اپنے افسرِ اعلیٰ پطرس کے اتنے قریب آگیا تھا کہ ان کی اجازت بلکہ ان کی معاونت سے اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری ملازمت اس کے خیالات کی آنچ مدھم نہ کرسکی بلکہ اس کی لَو تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اس کے ساتھ ہی خفیہ ایجنسیوں کے پاس اس کی فائل ضخیم سے ضخیم تر ہوتی چلی گئی اور اس کی دفتری ترقی میں ہمیشہ رکاوٹ بنی رہی۔

وہ تو اپنی کارکردگی کی بدولت یہ سوچے بیٹھا تھا کہ جلد ہی ترقی کی منزلیں طے کرلے گا لیکن پطرس کے قریب ہونے کے باوجود وہ وہیں کا وہیں تھا۔ وہ اتنا دل برداشتہ ہوگیا کہ ذرا ذرا سی بات پر غصے میں آکر استعفیٰ دے دیا کرتا تھا۔ پطرس اس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہورہے تھے۔

"کرشن، تم استعفیٰ چھپوا کر اپنی جیب میں کیوں نہیں رکھ لیتے" ایک دن پطرس نے کہا "جب بیٹھے بٹھائے غصہ آیا' استعفیٰ پیش کردیا مگر کچھ ہوگا نہیں۔ جب تک میں تمہارا ڈائریکٹر جنرل ہوں' تمہارا استعفیٰ منظور نہیں ہوگا۔"

"صاحب' آپ اس قدر مجھ پر مہربان ہیں تو میری ترقی کیوں نہیں ہوتی۔ مجھے پروگرام ایگزیکٹو یا اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کیوں نہیں بنادیا جاتا" کرشن نے کہا۔

"کرشن' تمہارے خلاف انگریزی حکومت کی سی آئی ڈی نے اتنی دبیز فائل تیار کررکھی ہے کہ تم جان ہی نہیں سکتے کہ میں کس قدر مشکل سے تمہاری ملازمت کو برقرار رکھے ہوئے ہوں۔"

اب وہ بالکل مایوس ہوگیا۔ اس قفس سے رہائی ملنی مشکل تھی۔ پھڑکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ترقی ہوتی تو تنخواہ بڑھتی جبکہ اخراجات بڑھتے جارہے تھے۔ مہینے کے آخر میں جیب خالی ہوجاتی تھی۔ منٹو نے اسے صلاح دی کہ فلموں میں بڑا پیسہ ہے۔ کیوں نہ ایک فلمی کہانی لکھی جائے۔ ان دنوں اسے ایک اونی سوٹ بھی سلوانا تھا اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ ناشرین سے بھی جلدی کوئی معاوضہ ملنے کی امید نہیں تھی۔

منٹو کا مشورہ اسے پسند تو آیا لیکن اسے فلمی کہانی لکھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن منٹو فلمی کہانیوں کی تکنیک سے خوب واقف تھا۔ دونوں نے مل کر ایک کہانی "بنجارا" لکھی اور کہانی کا مسودہ دہلی کے سیٹھ جگت نارائن' مالک جگت ٹاکیز' ڈسٹری بیوٹرز چاندنی چوک کے پاس لے گئے۔ کرشن تو نووارد تھا' سارا کام منٹو کررہا تھا۔

منٹو نے سیٹھ کو کہانی سنائی۔ کہانی سن کر سیٹھ نے کہا۔

"کہانی بہت اچھی ہے۔ ہم لوگ خرید لیں گے لیکن منٹو صاحب آپ نے مل منیجر کو بہت برا بتایا ہے۔ اسے اچھا دکھانا چاہیے ورنہ مزدوروں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔"

"تو اسے اچھا دکھادیں گے" منٹو نے معصومیت سے کہا۔

کرشن کہنے ہی والا تھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ منٹو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

سیٹھ نے پھر کہا "اور یہ جو منیجر کی بیوی ہے' اگر اس کی کنواری بہن ہو اور ہیرو سے پیار کرے۔ ایک ویمپ کے موافق۔ کیسا رہے گا منٹو صاحب!"

"بہت اچھا' بہت اچھا!" منٹو نے کہا۔

کرشن پھر حیران ہوا۔ یہ وہی منٹو ہے جو کسی کے لیے اپنی ایک سطر تو کیا ایک حرف بھی تبدیل نہیں کرسکتا۔ اس کے افسانے جوں کے توں شائع ہونے چاہئیں ورنہ وہ افسانہ واپس لے لے گا۔ یہ وہی منٹو ہے!

کہانی کا کچومر نکال کر جب وہ باہر نکلے تو منٹو نے کرشن کی خفگی کو بھانپ لیا۔

"بھئی' یہ ادب نہیں ہے۔ یہ فلم ہے جو پڑھے لکھے' ذہین اور ادب شناس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہمارے افسانے پرکھنے والے مولانا صلاح الدین ہیں' حامد علی خان ہیں۔ وہ سارو بھائی ٹوکرجی پٹیل یا منگو بھنگو جنگو اینڈ برادرس نہیں ہیں۔ اس لیے فلم میں ماں کو بہن اور بہن کو معشوق اور معشوق کو ویمپ بنادینا ہمارے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ سمجھے! ادب کی خدمت کرو اور فلم سے پیسے کماؤ۔ اب بولو' تمہیں سوٹ چاہیے کہ نہیں؟"

"چاہیے۔"

"تو فلمی کہانی میں تبدیلی ضرور ہوگی۔"

"ضرور ہوگی بھئی۔"

حسبِ ضرورت ترمیم کردی گئی اور کہانی کا معاوضہ پانچ سو روپے مل گیا جو دونوں نے آپس میں بانٹ لیا۔

اس واقعے نے کرشن کا ذہن فلم لائن کی طرف موڑ دیا اور وہ کسی مناسب موقع کی تلاش کا انتظار کرنے لگا۔

○☆○

منٹو کی فطرت میں رعونت بہت تھی۔ بات بات پر بھڑک اٹھتا تھا اور نشے کی حالت میں تو اس کو سنبھالنا دشوار

ہوجاتا تھا۔ وہ اپنی تعریف پر جتنا خوش ہوتا تھا' اپنی برائی یا تنقید پر اتنا ہی آگ بگولا ہوجاتا تھا۔ وہ اسی فطرت کو لے کر دلی ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔

ریڈیو اسٹیشن پر اس نے یہ نئی روایت ڈالی کی ہر ڈراما ٹائپ رائٹر پر براہِ راست لکھتا تھا۔ کرشن سے پوچھتا' آج ڈراما کس موضوع پر لکھا جائے۔ مضمون طے ہوجانے کے بعد وہ ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھاتا' کچھ دیر اسے گھورتا اور پھر انگلیاں حرکت میں آجاتیں۔ لکھتے لکھتے قریب بیٹھے ہوئے دوستوں کو سناتا بھی جاتا۔ اس کے خوشامدی دوست اور مختلف آرٹسٹ "منٹو صاحب' آپ ڈرامے کے بادشاہ ہیں" کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر چائے اڑایا کرتے تھے۔

اپنی اس برق رفتاری کی بدولت وہ ریڈیو کی ضرورت بن گیا۔ اسے اپنی اہمیت کا خود بھی احساس تھا جس نے اسے بددماغی کی حد تک بدمزاج بنادیا۔

یہ ماحول تھا جب مشہور افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کو بھی کرشن چندر نے لاہور سے دلی بلوایا۔ گویا دو شیروں کو ایک پنجرے میں بند کردیا۔

دلی ریڈیو کی ملازمت سے بہت پہلے کبھی اوپندر نے منٹو کی ایک کہانی "خوشیا" پر اپنی رائے دیتے ہوئے اسے دو کوڑی کی کہانی کہہ دیا تھا۔ یہ رائے منٹو تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ اس وقت اوپندر ناتھ کو جانتا نہیں تھا اس لیے بات آئی گئی ہوگئی لیکن جب اوپندر ناتھ ملازم ہوکر دلی ریڈیو پہنچا اور منٹو سے ملاقات ہوئی تو منٹو کو جیسے سب کچھ یاد آگیا۔ اسے اتفاق کہہ لیجئے کہ اوپندر بھی کسی کو خاطر میں لانے والا مزاج نہیں رکھتا تھا لہٰذا دو مضبوط برتن اتنی زور سے ٹکرائے کہ دور تک گونج سنائی دی۔

اوپندر ناتھ اسے جہاں کہیں ملتا' وہ اپنی مخصوص حقارت آمیز نگاہیں اس پر جمادیتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کردیتا۔ آخر اوپندر کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ اس نے کرشن چندر سے کہا "تم منٹو کو سمجھادو' وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے۔ میں طرح دے جاتا ہوں۔"

"تم بھی تنگ کرو۔ میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا" کرشن نے کہا۔

اب اوپندر کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ وہ سیدھا منٹو کے کمرے میں پہنچا۔

"میں نے تمہاری کہانی "دھواں" پڑھی۔" اوپندر نے اس سے کہا۔

"کیسی لگی؟" منٹو نے پوچھا۔

"بکواس' فحش۔"

"تم کیا جھک مارتے ہو' میں نے تمہارے ڈرامے پڑھے ہیں۔"

منٹو نے جان بوجھ کر اس کے افسانوں کا ذکر نہیں کیا گویا وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں تمہیں افسانہ نگار مانتا ہی نہیں۔

"میں تو ڈراما لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں مگر تم تو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو۔ تم کیا جھک مارتے ہو' اچھی طرح جانتا ہوں" اوپندر نے کہا اور اٹھ کر کرشن کے کمرے میں چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی کو جلتا ہوا چھوڑدو تو وہ کیسا تڑپتا ہے اسی لیے اس نے بحث کو طول نہیں دیا۔

منٹو کی بھڑاس تو ابھی نکلی نہیں تھی۔ وہ بھی پیر پٹختا ہوا کرشن کے کمرے میں آگیا۔ اوپندر اسے دیکھ کر اسٹوڈیو میں چلا گیا۔ منٹو کئی دن تک اسے گالیاں دے دے کر اپنا بخار اتارتا رہا۔

اس گفتگو کے بعد دونوں کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہوگئے۔ منٹو ان دنوں زوروں پر تھا۔ جب بات بہت آگے بڑھ گئی تو کرشن نے بھی منٹو کا ساتھ دیا۔ ن۔ م۔ راشد بھی منٹو کا دوست تھا اس لیے اوپندر ناتھ دبا دبا رہتا تھا لیکن اسی دوران میں منٹو نے راشد سے بھی بگاڑ لی۔

یہ بگاڑ منٹو سے زیادہ کرشن کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ شاید منٹو کی حمایت ہی کی یہ سزا اسے بھگتنی پڑی کہ راشد نے پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی پاتے ہی راشد کا تبادلہ لکھنؤ کرادیا۔

آل انڈیا ریڈیو' دہلی میں کرشن چندر نے ادبی لحاظ سے بڑا زرخیز اور معرکہ خیز دور گزارا۔ اوپندر ناتھ اشک' منٹو' راشد' دیوندر ستیارتھی جیسے ادیب بہ یک وقت وہاں جمع ہوگئے تھے۔ صحت مند رقیبانہ جذبے سے سرشار نخلِ ادب کی آبیاری کررہے تھے۔ اردو ادب اور خاص طور پر افسانہ نگاری اور ڈرامانویسی کا یہ بڑا روشن دور تھا۔

گھریلو اعتبار سے وہ قیامِ دہلی کے زمانے میں بھی ناآسودہ ہی رہا۔ ودیاوتی سے اس کی ذہنی مطابقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ اس کمی کو گھر سے باہر پورا کررہا تھا۔

کرشن حد درجہ نفاست پسند تھا۔ ہر چیز میں قرینہ سلیقہ اور خوب صورتی دیکھنے کا خواہاں تھا۔ ہر خوب صورت چیز اسے متاثر کرتی تھی۔ خوش شکل اور خوش عقل عورتوں سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ جہاں بھی ایسی صورت دیکھ لیتا' اس کے گرد دھونی رما کر بیٹھ جاتا۔

ایسے ہی کسی موسم میں اس نے کسی مشاعرے میں شاہدہ نکہت کو سنا۔ زہد شکن حسن اور مسحور کن ترنم۔ مشاعرہ تو اس نے لوٹ ہی لیا تھا' جب کرشن نے اس سے بات کی تو وہ بھی لٹ گیا۔ حسن ہو اور ذہانت ہو۔ یہی تو اس کی کمزوری تھے۔ شاہدہ میں یہ دونوں باتیں تھیں۔ دہلی کے مشاعروں پر چھائی ہوئی تھی' کرشن کے ذہن پر بھی چھا گئی۔

ان دنوں کرشن' افسانہ نگار کم اور شاعر زیادہ نظر آتا تھا۔ شاہدہ کے ساتھ ہر شعری نشست میں موجود نظر آنے لگا لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ شاہدہ کی زلفِ گرہ گیر کے اور بھی اسیر ہیں۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ جذبۂ رقابت کو برداشت کرنے سے قاصر تھا۔ وہ خاموشی سے دست بردار ہو گیا۔ بعد ازاں شاہدہ کی شادی ہو گئی۔

ناؤ نوش کی محفل تھی۔ کرشن کھل کر گلاب بن چکا تھا کہ کسی نے سرب جیت کور کا ذکر چھیڑ دیا۔ حسن و شباب کا پیکر ہے' موسیقار ہے' سحر طراز نغموں سے کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ وہ بچے کی طرح مچل گیا کہ ابھی اس کے گھر لے کر چلو۔

اس کا دوست ساحر ہوشیار پوری اسے لے کر سرب جیت کے گھر پہنچ گیا۔

سرخ و سفید' دبلی پتلی' سرو قد' کٹورا سی آنکھیں' بیس اکیس کا سن۔ یہ تھی سرب جیت کور۔

"آپ انہیں تو جانتی ہوں گی' یہ ہیں کرشن چندر مشہور افسانہ نگار" ساحر ہوشیار پوری نے تعارف کرایا۔

"آپ سے ملی تو نہیں ہوں لیکن میں نے آپ کا ہر افسانہ پڑھا ہے" سرب جیت نے کہا اور آگے بڑھ کر کرشن کے پاؤں چھو لیے۔

وہ بوڑھا نہیں ہوا تھا لیکن اس کے فن نے اسے محترم بنا دیا تھا۔ اتنا محترم کہ سرب جیت اس کے پاؤں چھونے پر مجبور ہو گئی۔

"انہیں کچھ سناؤ گی بھی یا پاؤں چھوتی رہو گی" ساحر نے کہا۔

"آج کرشنا جی میرے گھر چل کر آئے ہیں۔ انہیں نہیں سناؤں گی تو کسے سناؤں گی۔"

سرب جیت نے ایک فلمی گانا چھیڑا۔ وہ اس خوبی سے گا رہی تھی کہ کرشن کو اصل کا گمان ہونے لگا۔

اس نے پے در پے کئی گانے سنائے اور ہر گانے کو اس خوبی سے ادا کیا کہ کرشن اس کے فن کا قائل ہو کر اٹھا۔

"یار' یہ شہرت ہے بہت بری چیز" کرشن نے سرب جیت کے گھر سے واپس آتے ہوئے اپنے دوست سے کہا۔

"کیوں؟"

"اب یہی دیکھ لو۔ یہ لڑکیاں عاشق سمجھنے کے بجائے بزرگ سمجھ کر پاؤں چھونے لگتی ہیں۔ خیر' میں اسے اپنا قائل کر کے ہی چھوڑوں گا۔"

گھر پہنچتے ہی اس نے سرب جیت کو بھلانے کے لیے بوتل اور گلاس کا سہارا لیا۔ نشہ تیز ہوا تو سرب جیت کے حسن کی آنچ بھی تیز ہونے لگی۔ اس نے یہ رات پہلے عشق کی پہلی رات کی طرح گزاری۔

دوسرے دن وہ پھر سرب جیت کور کے گھر پہنچ گیا۔

وہ ایک مہینے تک مسلسل اس کے گھر جاتا رہا لیکن وہ اس کی جانب ملتفت نہ ہوئی۔ اس کا رویہ عقیدت مندانہ تھا محبوبانہ نہیں۔ کرشن کو بھی یقین ہو گیا کہ اس کا عشق یک طرفہ ہے لہٰذا مجبور ہو کر کنارہ کش ہو گیا۔

کسی تقریب میں اس کی ملاقات سلیمہ جعفری سے ہوئی۔ نہایت خوش شکل' مہذب اور آزاد خیال۔ کرشن کو تعارف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ انہیں پہلے سے جانتی تھی۔

"آپ کے مشاغل کیا ہیں؟" کرشن نے پوچھا۔

"ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ مصوری کرتی ہوں' شعر کہتی ہوں' اچھے لوگوں سے مل کر خوش ہوتی ہوں۔ میرے خیال میں اتنے مشاغل بہت ہیں۔"

"اچھے لوگوں سے ملنے والا مشغلہ غلط ہے۔"

"ارے وہ کیوں؟" وہ چونک کر بولی۔

"بھئی' اس طرح آپ ہم سے مل کر تو خوش ہوں گی نہیں۔"

"یہ کس نے کہہ دیا کہ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

"کیا آپ نہیں جانتیں کہ میں شراب پیتا ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔ وہ تو سبھی ادیب پیتے ہیں۔ اس سے آدمی برا تو نہیں ہو جاتا۔"

"اچھا آپ میرے افسانوں کے بارے میں کیا کہیں گی۔"

"آپ دراصل شاعر ہیں۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے نثر لکھتے ہیں۔"

اس کی اس رائے پر کرشن لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ جچی تلی رائے کسی عام عورت کی نہیں ہو سکتی۔

"آپ تو ادب پر بڑی اچھی نظر رکھتی ہیں۔ آپ سے تو تفصیل سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"کرشن صاحب، ادب کو بیچ میں کیوں گھسیٹتے ہیں۔ آپ ویسے بھی میرے گھر آسکتے ہیں۔ مجھے اپنے گھر میں آپ کو دیکھ کر خوشی ہوگی۔"

وہ تو ایسے ٹھکانوں کی تلاش میں رہتا تھا جہاں گھر سے دور رہ کر کچھ وقت کٹ جائے۔ سلیمہ ایسی شائستہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کی معیت میں بہت سارا وقت گزارا جاسکتا تھا۔

اجازت ملتے ہی اس نے سلیمہ کے گھر جانا شروع کردیا۔

کچھ دنوں بعد ہی اس گھر میں غیر معمولی چہل پہل نظر آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ سلیمہ کی شادی ہو رہی ہے۔

سلیمہ کی شادی کے ساتھ ہی اس کا یہ عشق بھی دم توڑ گیا۔

اس نے ہزار گناہوں کے داغ اپنے سینے پر لیے۔ دل کے آئینے کو ہزار صورتوں سے سجایا۔ ہزار وادیوں میں بھٹکا۔ سیکڑوں راتیں جاگ کر گزاریں۔ اس ایک لمحے کو ڈھونڈنے کے لیے، اس ایک چہرے کو تلاش کرنے کے لیے جسے چھوتے ہی وہ کندن بن جائے لیکن یہ سب سنگِ میل تھے، منزل نہیں۔

اب تک وہ افسانے لکھتا رہا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں اس نے اپنا پہلا ناول "شکست" لکھا۔ اس کی اس اولین کاوش ہی نے اسے صفِ اول کے ناول نگاروں میں لا کھڑا کیا۔

فطری حسن کی منظر نگاری، کرداروں کا گہرا نفسیاتی مطالعہ، روزمرہ کا عمیق مشاہدہ، زبان کی رنگینی و رعنائی اور لطافت و شیرینی، چست مکالمے۔ ان سب نے مل کر "شکست" کے حسن کو دوبالا کردیا تھا۔

وہ اپنی اس کامیابی پر بے پناہ خوش تھا لیکن ادبی دنیا میں ڈاکٹر تاثیر کا تبصرہ پڑھ کر سخت مایوس ہوا۔ اس کی حساس فطرت نے اس بے جا تنقید کا اتنا اثر قبول کیا کہ اپنی ادبی صلاحیتوں پر سے اس کا ایمان ہی اٹھ گیا۔

ڈاکٹر تاثیر نے اس ناول کے عیب شمار کرنے کے بعد اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ "تم ابھی طفلِ مکتب ہو۔ تمہیں ناول نویسی سے بھی توبہ کرلینی چاہیے تاکہ تمہاری عاقبت خراب نہ ہو۔"

ہر بڑے فنکار کی طرح اسے بھی اپنی فنی صلاحیتوں پر کامل یقین نہیں تھا۔ اس تنقید نے اس کا اعتماد مزید کمزور کردیا حالانکہ اس وقت تک اس کے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہوکر شرفِ قبولیت حاصل کرچکے تھے۔

اس پر یہ احساس طاری ہوگیا کہ وہ ادیبانہ صلاحیتوں سے یکسر عاری ہے اور مستقل طور پر تصنیف و تالیف کی راہ اختیار کرنے سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ یہاں تک سوچنے لگا کہ وکالت کا پیشہ اختیار کرکے ادب کی خدمت سے باز آجائے۔

ان ہیجانی لمحوں کو اس نے شراب میں ڈبونے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس غیر یقینی حالت سے نکل نہیں سکا۔ اس کی خوش گوار باتیں اندر ہی اندر کہیں دب کر رہ گئی تھیں۔

نومبر کی ایک سرد شام تھی کہ اسے اس کا دوست اور راز داں کنہیا لال کپور مل گیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھِل جاتا تھا لیکن آج وہ بجھا بجھا تھا۔ کنہیا لال نے کئی مرتبہ اس سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ تصویر کی طرح خاموش تھا۔

"کیا تم سمجھتے ہو میں ادیب نہیں ہوں" کرشن چندر نے چیخ کر کہا جیسے تصویر کو اچانک زبان مل گئی ہو۔

"جی ہاں۔" کنہیا لال نے شرارت سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ڈاکٹر تاثیر نے ٹھیک لکھا ہے۔"

"جی ہاں۔"

کرشن پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اسے کنہیا لال سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کنہیا لال کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے۔

"کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ میں ادیب نہیں ہوں؟"

"قسم نہیں کھاؤں گا۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے اب تک جو کہا، وہ بکواس تھی؟"

"جی ہاں۔"

"میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔ مجھے ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہے کہ میں کدھر جاؤں۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"اگر واقعی مجھے لکھنا نہیں آتا تو کل سے کیوں نہ وکالت شروع کردوں؟"

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا" اس مرتبہ کنہیا لال چیخا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہیں واقعی لکھنا آتا ہے۔"

"اس کا ثبوت؟"

"تم ایک رائے پر اتنے مایوس ہوگئے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ "ادبی دنیا" اور "ہمایوں" کے مدیر نے تمہارے بارے میں کتنی توصیفی رائے کا اظہار کیا تھا۔"

"میں ان کی نہیں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔"

"میرے خیال میں تمہیں لکھنا آتا ہے۔"

"تم یہی بات قسم کھا کر کیوں نہیں کہتے؟"
"اصرار کروگے تو قسم بھی کھالوں گا لیکن ایک بات بتادوں کہ وہ وقت بہت قریب ہے۔ جب تم بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوگے۔"
"میری قسم کھاؤ۔"
"تمہاری قسم۔"
کرشن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی "میں ضرور لکھوں گا۔ میں ادیب ہوں' نقاد جائیں جہنم میں۔"
ایک مخلص دوست کے مخلصانہ مشورے نے ایک ادیب کو وکیل بننے سے بچالیا۔
اس نے نقادوں کے خیالات کی پڑیا بنا کر دل میں رکھی اور لکھنے بیٹھ گیا۔
لکھنؤ کے ادبی ماحول نے اس کی صلاحیتوں کو مزید نکھارا۔ لکھنؤ کی ملازمت نے فراق' مجاز' حیات اللہ انصاری' احتشام حسین اور سبط حسن جیسے دوستوں سے نوازا۔
لکھنؤ میں بھی اس کی ہردل عزیزی نے وہی رنگ اختیار کرلیا جو دہلی میں تھا۔ اس کا گھر دوستوں سے اور دسترخوان کھانوں سے بھرا رہتا تھا۔ مرچ مسالوں کے چٹخارے' ہندو ہوتے ہوئے گوشت کے کباب اس کی مرغوب غذا تھے۔ پلاؤ کی خوشبو اسے دیوانہ کردیتی تھی۔ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوتیں۔ شراب کے دور چلتے۔ دوست رخصت ہوجاتے تو وہ دن بھر کے تجربات کو کسی افسانے کے سپرد کرکے سورہتا۔
لکھنؤ کے چھبیلے سلام' شرمیلے کلام' مے خانے' بالا خانے اس کی روح کو سرشار کررہے تھے لیکن اب وہ ریڈیو کی ملازمت سے اکتا چکا تھا۔ چاہتا تھا کسی طرف نکل جائے مگر کہاں؟ اسے منٹو کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ دلی ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی چلا گیا ہے اور فلموں کی کہانیاں لکھ کر پیسے کمارہا ہے۔ اسے وہ واقعہ یاد آگیا جب اس نے سوت سلوانے کے لیے منٹو کے ساتھ مل کر فلمی کہانی لکھی تھی۔ اسے بھی بمبئی جانا چاہیے لیکن وہ وہاں کرے گا کیا۔ اسے کون جانتا ہوگا۔
وہ ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ پونا کی شالیمار پکچرز سے فلم پروڈیوسر ڈبلیو' زیڈ احمد کا تار آیا جس میں اسے بطور مکالمہ نگار ملازمت کی پیش کش کی گئی تھی۔ گھر بیٹھے لکشمی نے دستک دے دی تھی۔
اسے اس بات کا احساس ہوچکا تھا کہ اس جیسے اشتراکی ادیب کے لیے سرکاری ملازمت میں ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ وہ اس قفس کو توڑ کر اڑجانا چاہتا تھا۔ اب جو اسے سہارا ملا تو اس نے موقع غنیمت جانا اور اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔
اس کے دوستوں نے اسے روکنا چاہا' افسران نے سمجھایا لیکن وہ پونا روانہ ہوگیا۔ اپنی بیوی ودیا وتی سے اور دور ہوگیا۔
ڈبلیو' زیڈ احمد نہایت نستعلیق اور ادیب دوست ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو شالیمار کمپنی میں ایک جگہ جمع کرلیا تھا جو باقاعدہ ادیب وشاعر تھے۔ ان لوگوں کی موجودگی نے اسٹوڈیو ہی میں نہیں' پونا شہر میں ایک ادبی ماحول پیدا کردیا تھا۔ جوش' ساغر نظامی' اخترالایمان' ایک ہندی شاعر بھرت ویاس جیسے لوگ یہاں تھے۔ ان حضرات سے ملنے تقریباً تمام قابلِ ذکر ادیب وشاعر بمبئی سے پونا آتے رہتے تھے۔
کرشن چندر پونا پہنچا تو اس ادبی ماحول نے پہلے دن ہی اس کے قدم پکڑ لیے۔ شالیمار اسٹوڈیو شنکر سیٹھ روڈ پر تھا جو شہر سے باہر کا علاقہ تھا اور اس کے آس پاس چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔
شالیمار پکچرز کی فضا بڑی کشادہ' بڑی آزاد اور بڑی دل خوش کن تھی۔
تیس سال کے خوبرو کرشن چندر نے اسٹوڈیو میں قدم رکھا تو ہر طرف حسن وجوانی کی رنگینیاں اور رعنائیاں ہر طرف بکھری ہوئی دیکھیں۔ نسوانی حسن وجمال کی تصویر اداکاراؤں کے نازو انداز اس کے لیے دروازۂ بہشت کا نظارہ تھے۔ یہ ماحول اس حسن پرست سے بہت قریب بھی تھا اور اس کے لیے نیا بھی۔ زندگی میں جتنی اچھی چیزیں ہیں جیسے اچھے کھانے' اچھی شراب' اچھے دوست مرد ہوں یا عورت اسے سب پسند تھے۔
یہ پسندیدگیاں اپنی جگہ' تنخواہ بھی ساڑھے چھ سو طے ہوئی۔ زیڈ احمد کا رویہ بھی مشفقانہ تھا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔
اس نے ۱۳ تلک روڈ پر مکان کرائے پر لیا اور کام شروع کردیا۔ ان دنوں "من کی جیت" نامی فلم بن رہی تھی جس کے مکالمے لکھنے کا کام کرشن چندر کو سونپا گیا۔ گانے جوش اور بھرت ویاس کے ذمے تھے۔
کرشن تو جہاں جاتا تھا دوستوں کا جمگھٹا لگالیتا تھا۔ پونا پہنچتے ہی یہاں کے دوست اسے کم پڑے تو اس نے دلی ریڈیو

کے بعض آرٹسٹوں کو یہاں بلالیا۔ ان میں پریم، راج کمار اور محمد حسین شامل تھے۔

ایسٹ اسٹریٹ پر ایک ہوٹل تھا جہاں بُھنا گوشت بہت اچھا ملتا تھا۔ کرشن نے اپنے دوستوں کی بھیڑ وہاں جمالی۔

ہوٹل کے مالک کی طرف سے پینے پلانے کی اجازت ملنے کے بعد تو یہ ہوٹل ان بے فکروں کا دوسرا گھر بن گیا۔

جب اس ٹکڑی کی شہرت پھیلنے لگی تو نئے نئے کبوتر اترنے لگے۔ انہی میں اداکار شیام اور اداکار مسعود پرویز تھے۔ دونوں خوب صورت، مردانہ وجاہت سے مالا مال اور کرشن سمیت تینوں کا عہدِ شباب۔ کرشن کے گھر لڑکیوں کا ہجوم بسیرا کرنے لگا۔ گھر سے اُکتا کر سڑک پر نکل آتے۔ ہاتھوں میں ہاتھ، گیتوں کے بول، جذبوں کی آنچ۔ ایک برادری ایک خاندان۔

ان ہنگامہ خیزیوں کے باوجود ادبی تسکین کے لیے بھی اس نے حالات کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا۔ دوسرے تیسرے دن اس کے گھر ادبی محفل منعقد ہوتی تھی جن میں اس کے دوست ادیب، مقامی ادیب اور کبھی کبھی بمبئی سے آئے ہوئے ادیب و شاعر شریک ہوتے تھے، ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ پونا میں رہتے ہوئے ہی اس نے اپنے شاہ کار افسانے "اَن داتا" اور "موبی" لکھے۔

جن دوستوں کو اس نے دلی سے پونا بلایا تھا، ان میں ایک اداکارہ ثمینہ خاتون بھی تھی۔ معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی بظاہر اس میں کوئی ایسی جاذبیت نہیں تھی کہ کوئی اس پر مرتا لیکن کرشن اس پر مرتا تھا۔

کرشن کی حُسن پرستی کا کوئی ایک رخ نہیں تھا۔ وہ صرف ظاہری حسن کا دلدادہ نہیں تھا، باطنی حسن بھی اس کی توجہ کا مرکز بنتا تھا۔ یہاں بھی یہی معاملہ تھا۔ ثمینہ کا دل نشین لب و لہجہ اور اس کی شستہ زبان اس کی فریفتگی کا باعث بن گئی۔

اس کا عشق انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ رات دن وہ اس کی دلداری میں ایسا مصروف تھا کہ دوستوں کے لیے بھی اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس کی کوششوں سے ثمینہ کو شالیمار پکچرس میں کام مل گیا۔ اسی کی کوشش سے اسے مکان ملا۔

کرشن اس لڑکی پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ دوست اس کی محبت سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے، فکرمند بھی تھے۔ اس کا عشق پونا کی رنگین زندگی میں ایک اور رنگینی کا اضافہ کر رہا تھا۔

اب یہ عالم ہو گیا تھا کہ کرشن کے دوست اسے ثمینہ خاتون کا نام لے کر چھیڑنے لگے تھے۔ ایک روز اداکارہ نواب بیگم اخترالایمان کے پاس آئیں۔ نہایت مایوس اور افسردہ نظر آ رہی تھیں۔

"کیا ہوا تمہیں۔ اتنی بجھی بجھی کیوں نظر آ رہی ہو؟" اختر نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں، میں تو ان کی بہت عزت کرتی تھی لیکن آج انہیں اس حال میں دیکھ کر افسوس ہوا۔"

"کسے دیکھ لیا؟"

"چھوڑیئے بھی، پوچھ کر کیا کریں گے۔ اس بڑے قلم کار کے لیے میرے ذہن میں جو تصور تھا، بُری طرح مجروح ہوا ہے۔"

"تم کس کا ذکر کر رہی ہو۔ میری تو سمجھ میں کچھ آ نہیں رہا ہے۔"

"کرشن چندر کا اور کس کا۔"

"کیوں، کیا ہوا اسے؟" اختر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"میں نے ابھی راستے میں کرشن چندر کے ساتھ ثمینہ خاتون کو دیکھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ تم بھی تو لڑکی ہو اور میرے پاس بیٹھی ہو۔"

"یہ بات اور ہے۔ وہ تو ثمینہ خاتون کا چپل ہاتھ میں لیے موچی کے پاس جا رہے تھے۔"

"یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں۔ اگر تم میرے ساتھ بازار جاؤ اور تمہاری چپل ٹوٹ جائے تو میں بھی یہی کروں گا۔"

"آپ نہیں سمجھیں گے" نواب بیگم نے کہا اور اسی ملال کے عالم میں اٹھ کر چلی گئیں۔

اس کے جانے کے بعد خود اختر نے سوچا کہ کرشن اس عشق میں اپنی فنکارانہ عظمت کو بھی بُھلا بیٹھا ہے۔

من کی جیت ریلیز ہوئی اور ہٹ ہو گئی اور سلور جوبلی منائی۔ اس فلم نے کرشن چندر پر ترقی کی راہیں کھول دیں۔ ڈبلیو زیڈ احمد بھی کرشن سے بہت خوش تھے۔ وہ اگلی فلم "غلامی" شروع کرنے والے تھے۔ ممکن ہے کرشن کو اس میں بھی کام ملتا لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے پونا سے کرشن چندر کا آب و دانہ اٹھا دیا۔

اداکار بلراج ساہنی شالیمار پکچرز میں ملازمت کی غرض سے آئے ہوئے تھے لیکن معاوضے سے مطمئن نہیں تھے۔ کرشن نے ان سے اپنی دوستی کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ احمد صاحب کی محبوبہ اور ہیروئن نینا دیوی

کو ان کی تنخواہ بڑھانے کے لیے سفارش کرنے پر آمادہ کرلیں تو ان کا کام بن سکتا ہے۔
اس مشورے کو کئی دن گزر گئے تھے کہ ایک دن ڈبلیو زیڈ احمد نے کرشن چندر کو اپنے آفس میں بلایا۔ وہاں نینا بھی موجود تھی۔
"آپ نے بلراج ساہنی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ نینا دیوی سے ان کی تنخواہ بڑھانے کی سفارش کرائیں؟"
بات سچ تھی لیکن اچھی نہیں تھی۔ کرشن کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اس نے بڑی ندامت محسوس کی۔
چند لمحے کمرے میں سناٹا چھایا رہا پھر احمد صاحب بولے۔
"آج سے ہم آپ کی تنخواہ بڑھائے دیتے ہیں۔"
اسے ایسا لگا جیسے اس کے منہ پر کسی نے زوردار چانٹا مارا ہو۔ احمد صاحب نے بڑی خوب صورتی سے بڑا گہرا طنز کیا تھا۔

وہ اس وقت تو ان کا شکریہ ادا کرکے کمرے سے نکل آیا لیکن سوچنے لگا کہ اب اس کا پونا میں رہنا ٹھیک نہیں۔ کاش! مجھے کوئی بمبئی بلالے۔
فلمی زندگی میں اب اس نے اتنا نام پیدا کرلیا تھا کہ بمبئی کی فلمی دنیا میں قدم جمانا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ بمبئی میں کتنے ہی لوگ تھے جو اس کی مدد کرسکتے تھے۔ کتنے ہی دوست تھے جو اسے خود بلانا چاہتے تھے۔ اس کی مرضی دیکھی تو وہ بھی سرگرم ہوگئے۔
کامیابی کی امید بندھتے ہی کرشن نے شالیمار پکچرز سے استعفیٰ دیا، سامان باندھا اور بمبئی پہنچ گیا۔
بمبئی ٹاکیز میں انچارج، اسٹوری ڈیپارٹمنٹ کے طور پر اسے ملازمت مل گئی۔ اس کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ یہ معاوضہ اتنا تھا کہ وہ ایک شاندار زندگی کے خواب دیکھ سکتا تھا لیکن اخراجات اب اتنے بڑھ گئے تھے کہ یہ رقم بھی کم پڑتی تھی۔ یہاں بھی اس کا گھر مہمان سرا بنا ہوا تھا۔ آٹھ دس مہمان۔ بے کاری کے دن گزارنے والے، کام کی تلاش میں بمبئی آنے والے، بمبئی گھومنے والے، اداکار، ادیب، شاعر اور ایسے بھی جو کچھ نہیں تھے محض اس کے دوست تھے، بستر ڈالے اس کے گھر پڑے رہتے تھے۔ کھانے کا ہی نہیں، ان کی شراب کا خرچ بھی کرشن کے ذمے تھا اور وہ اس مہمان داری کو فراخ دلی کے ساتھ نبھا رہا تھا۔
اب وہ اپنی زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گیا تھا جہاں لالہ صحرائی کو نشانِ منزل نظر آنے لگا تھا۔ یہ زمانہ ۱۹۴۶ء کا تھا۔ ملک کی تقسیم قریب تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ بمبئی کی فلمی دنیا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسٹوڈیوز سنسان ہوگئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔
وہ اپنی زندگی کے طور طریقوں میں نہ ہندو تھا نہ مسلمان۔ اسے کسی مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا لیکن انسانوں کا خون بہتا دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ سب کے لیے تو یہ محض فسادات تھے لیکن اس کے تو تصورات کا خون ہو رہا تھا۔ وہ خود کو اشتراکی کہتا تھا۔ امن اور مساوات کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ اب اس کا ہر خواب خون میں نہایا سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ کہیں مسلمان کی صورت میں کہیں ہندو کے روپ میں۔ وہ نہ ہندو کی موت پر آنسو بہا سکتا تھا نہ مسلمان کے قتل پر خوش ہوسکتا تھا۔ وہ تو یہ دیکھ رہا تھا کہ انسانیت قتل ہو رہی ہے۔ انسانی رشتوں پر تلوار چل رہی ہے۔ خوف کے مارے مسلمان اداکاروں نے اسٹوڈیو آنا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے مسلمان دوستوں کو ان کے گھروں تک اسے خود چھوڑ کر آنا پڑتا تھا کہ راستے میں ہندوؤں کے کئی محلے آتے تھے۔
یہ ایسا تجربہ تھا جو اس سے پہلے اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔
ایک حساس ادیب ہونے کے ناتے وہ ہنگامی حالات سے خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، فوراً متاثر ہوتا تھا اور انہیں اپنی تحریروں کا موضوع بنانا اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں قحطِ بنگال سے متاثر ہوکر اس نے شہرۂ آفاق افسانہ "ان داتا" لکھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جب پرل ہاربر کی لڑائی زوروں پر تھی، اس نے اپنا مشہور افسانہ "موبی" لکھا۔ تحریکِ آزادی کے دوران میں جب بحریہ کے فوجیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تو کرشن چندر نے افسانہ "تین غنڈے" لکھا۔
تقسیمِ ملک اور اس کے صلے میں فسادات کے تحفے تو اس کے اپنے معاملات تھے۔ یہ فسادات اس لیے بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھے کہ وہ ایک ترقی پسند تھا۔ ترقی پسندوں نے ایک ایسی مشترکہ انسانی تہذیب کا خواب بُنا تھا جس میں مذہب کو برتری حاصل نہیں تھی۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ان کا مسلک ایک قوم، ایک ملک اور ایک تہذیب تھی۔ وہ تہذیب کو ہندو اور مسلمانوں کے خانوں میں بانٹ کر دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ کرشن تو یوں بھی اپنے طرزِ زندگی میں مسلمانوں سے بہت قریب تھا۔
ان جاں گداز واقعات سے متاثر ہوکر اپنے جذبات اور احساسات کو فن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا اس کی روایت کا حصہ تھا۔ اور یہ بھی ضروری تھا کہ لکھنے سے پہلے وہ

کم از کم بمبئی کے ان علاقوں کا بہ چشم خود جائزہ لے جو ان فسادات کا مرکز تھے۔ ہندو علاقوں میں تو وہ خود گھوم پھر کر دیکھ چکا تھا۔ مسلم علاقوں میں جانے کے لیے اسے اپنے مسلمان احباب کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے دوستوں سے تقاضا کرتا رہا کہ وہ اسے فساد زدہ علاقوں میں لے چلیں۔ احباب اسے متنبہ کرتے رہے کہ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کسی نے پہچان لیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔

جب یوں کام نہیں چلا تو اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ وہ ایک روز حمید اختر (افسانہ نگار) کے گھر پہنچ گیا۔

"یار' ذرا بھنڈی بازار تک جانا ہے۔ چلو چلتے ہیں۔"

"جناب' بھنڈی بازار محمد علی روڈ پر ہے۔ وہاں کی حالت تمہیں معلوم ہے۔ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتے ہو۔"

"یار' گوشت کھائے ہوئے ہفتہ ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے منہ کا ذائقہ درست کرالاؤ۔"

"وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو تمہیں جانتے ہیں' تمہیں صورت سے پہچانتے ہیں۔ خود ہوٹل والا تمہیں جانتا ہو گا۔ کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہو۔"

"کچھ نہیں ہوتا یار۔ گوشت کھانے کی لت ایسی پڑ گئی ہے کہ وہاں جائے بغیر اب میں رک نہیں سکتا۔ تم نہیں چلتے تو میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں۔"

مجبور ہو کر حمید اختر تیار ہو گئے لیکن دل ہی دل میں ڈر ضرور رہے تھے۔ وہ کرشن کے ساتھ کئی مرتبہ اس علاقے میں گئے تھے لیکن پہلے کی بات اور تھی۔

وہ بھنڈی بازار پہنچ کر ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے سر سے پاؤں تک کرشن کا جائزہ لیا جیسے پہچان گئے ہوں اور پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ حمید اختر کو پسینے آ گئے لیکن کرشن مزے سے گوشت کھانے میں مشغول تھا۔

"تمہیں معلوم ہے' اشوک کمار مسلمانوں کے محلے میں پہنچ گئے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ وہ جیسے ہی گاڑی سے اُترے سب کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ یہاں یہی میرے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"جلدی کھاؤ' اب چلنا بھی ہے۔"

"چلتے ہیں' ذرا رات تو ہو لے۔"

اب کرشن چندر اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کھانا کھا کر اور علاقے میں پیدل گھوم پھر کر کرشن چندر واپس آیا تو اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔

"گوشت کھانے کا تو بہانہ تھا" کرشن نے کہا "دیکھنا یہ تھا کہ عام لوگ مجھ پر ہاتھ اٹھاتے ہیں یا نہیں۔ دیکھو سب نے مجھے پہچانا مگر کسی نے حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فسادات نہ غریب ہندو کرتے ہیں نہ غریب مسلمان بلکہ یہ اور ہی لوگ ہوتے ہیں۔"

"پھر بھی احتیاط کیا کرو "یہ اور لوگ" بھی تمہیں کسی جگہ مل سکتے ہیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو" کرشن نے کہا "ویسے مجھے جو دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا۔"

اس کے بعد اس نے صرف پندرہ دن کی قلیل مدت میں چھ معرکہ آرا افسانے فسادات کے موضوع پر لکھے جو "ہم وحشی ہیں" کے عنوان سے شائع ہوئے۔

فسادات کے موضوع پر دیگر افسانہ نگاروں نے بھی لکھا۔ عصمت چغتائی کا افسانہ "جڑیں" خواجہ احمد عباس کا "سردار جی" راجندر سنگھ بیدی کا "لاجونتی" فکر تونسوی کا "چھٹا دریا" اور منٹو کے افسانے لیکن ان سب میں کرشن چندر کو فوقیت حاصل رہی اس لیے کہ اس نے ان افسانوں کو غیر مذہبی آدمی کی حیثیت سے دیکھا۔ ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان لہٰذا ان افسانوں میں توازن کا احساس ہوتا ہے۔

وہ اس لیے بھی اس دور میں اہمیت اختیار کر گیا کہ اس نے نہ صرف خود لکھا بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دلائی کہ وہ فساد کے موضوع پر لکھیں۔ گویا فسادات کے موضوع پر لکھنا اس کے لیے روحانی فریضہ بن گیا تھا۔

یہ اس کی صلح پسندی ہی تھی کہ پاکستان کی طرف سے اس کے دل میں نفرت کے جذبات نہیں ابھرے بلکہ وہ پاکستان کی ترقی و خوش حالی کا دل سے خواہاں تھا۔

"میں تو پاکستان کی سلامتی اور ترقی کا دل سے خواہاں ہوں اور ہندوستان کی سلامتی کا بھی۔ میں سوچتا ہوں دونوں ملک اپنی اپنی جگہ پر آزاد اور خود مختار رہتے ہوئے ایک دوسرے سے خیرسگالی سے کام لیتے ہوئے اس طرح کے تعاون کا ثبوت دیں جس سے اس برصغیر کے غریب انسانوں کے مسائل حل ہو سکیں۔ نفرت کی دیواریں مسمار ہوں اور مصالحت اور مفاہمت کی بنا پر تعلقات استوار ہوں۔"

(ناول "غدار")

کرشن کا قلم بڑی روانی سے چل رہا تھا۔ فسادات کے

سلسلے میں اس کے دل نے اتنے چرکے کھائے تھے کہ وہ چیخ اٹھا تھا لیکن اس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور برابر اپنے افسانوی ادب سے لوگوں کے دلوں پر مرہم رکھتا رہا۔ جب فسادات کی آگ سرد پڑی تو اسے تھوڑا سا سکون ملا لیکن اب ایک آزاد ملک میں جو روز مرہ کے مسائل پیدا ہو رہے تھے' وہ ان سے نبرد آزما ہو گیا۔

اب وہ ایک ایسے افسانہ نگار کا روپ دھارتا جا رہا تھا جس کے افسانے' حقیقت کا روپ دھار چکے تھے' جس کی تحریروں میں وقت کی آواز بولتی تھی' جس کا ہاتھ مسائل کی نبض پر تھا' یہ افسانے نہیں' کسی دانش ور کی رائے تھی جو فن کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔

اس نے بمبئی پہنچتے ہی بمبئی ٹاکیز میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔

وہ ملازمت سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا لیکن یہ اس کی مجبوری بھی تھی کہ وہ صرف ادب کو اپنی روزی کا ذریعہ نہیں بنا سکتا تھا البتہ فلمی دنیا میں آنے کے بعد وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ فلموں سے بہت کچھ کمایا جا سکتا ہے۔ یہاں ہونے والی دولت کی ریل پیل نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ بمبئی ایک بڑی فلم انڈسٹری تھی۔ یہاں کام کرنے کے مواقع بھی زیادہ تھے اور اسے اپنے قلم پر اعتماد بھی تھا۔ بمبئی ٹاکیز میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ اپنے قلم کو فروخت کرنے کے بجائے اگر وہ اسے اپنے لیے استعمال کرے تو زیادہ منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک شاندار زندگی ہمیشہ سے اس کا خواب رہی تھی۔

وہ آنکھیں بند کر کے اس سیلاب میں کود پڑا۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دیا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی "ماڈرن تھیٹر" کے نام سے قائم کرلی۔

کمپنی قائم ہوتے ہی اس کی محبوبہ دلنواز ثمینہ خاتون بھی پونا سے بمبئی پہنچ گئی۔

ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ وکٹوریہ ٹرمنس سے سترہ اسٹیشن دور اندھیری کے ساحل پر واقع کوور لاج میں منتقل ہو گیا۔ کوور لاج میں تاڑ اور ناریل کے ہرے بھرے جھنڈ تھے۔ آم اور چیکو کے پیڑ تھے' جنگلی پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ یہاں بہار رُت میں کوئل کوکتی اور طوطے شور مچاتے تھے۔ نچلی منزل اس نے بیوی بچوں کے لیے مخصوص کی ہوئی تھی اس کی بہن سرلا اور بھائی مندر بھی آگئے تھے۔

دوسری منزل آنے جانے اور ٹھہرنے والوں کے لیے مخصوص تھی۔ دن بھر اخبار نویس' شاعر' فلمی ایکسٹرا' گویّے' مزدور لیڈر اور ناکام فلم ڈائریکٹر وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ یہ گھر چوبیس گھنٹے جاگتا تھا۔ اس گھر نے سرائے کی سی شہرت اختیار کرلی تھی۔ جس کے پاس رہنے کا ٹھکانا نہیں ہوتا اور کرشن سے تھوڑی سی شناسائی نکل آتی' اس کے لیے لکڑی کے فرش پر ایک بستر کا اضافہ ہو جاتا۔ اس منزل پر خاموشی کا راج ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ دن بھر اور رات گئے تک آوازوں کی دنیا قہقہوں سے آباد رہتی تھی۔ نیچے البتہ خاموشی تھی۔ اس کی بیوی ودیاوتی اب ان ہنگاموں کی عادی ہو گئی تھی۔ اس نے اب کرشن سے لڑنا چھوڑ دیا تھا لیکن خوش بھی نہیں تھی۔ بس ایک سمجھوتا سا کرلیا تھا۔ اس کی دونوں بچیاں اسکول جانے لگی تھیں۔ ان کے اسکول جانے کے بعد نچلی منزل قطعی سنسان ہو جاتی تھی۔ باہر لگے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی آوازیں کبھی کبھی اس سناٹے کو توڑتی تھیں۔

اس سناٹے میں عجیب وغریب حلیے کا ایک آدمی لکڑی کا زینہ اترتے چڑھتے دکھائی دیتا تھا جو اس سناٹے کو پُراسرار بنا دیتا تھا۔ یہ میرا جی تھا جو مستقل کرشن چندر کے پاس رہتا تھا۔

ان دنوں کرشن چندر مغل اعظم بنا ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں ایک کار کی تمنا کی تھی' اب اس کے پاس تین تین کاریں تھیں۔ اسے ایک نوکر کی ضرورت تھی لیکن چار چار نوکر اس کی خدمت میں حاضر تھے۔ زمین آسمان ہی بدل گئے تھے۔

اس نے دلی ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ایک ڈراما "سرائے کے باہر" لکھا تھا جو نشر بھی ہوا تھا۔ پونا کے قیام کے دوران میں اس کو اسٹیج پر بھی پیش کیا تھا۔ اپنی ذاتی فلم کمپنی کے تحت اس نے اس کی کہانی کو سلولائیڈ پر اتارنے کا ارادہ کیا۔

جب وہ اس فلم کی کاغذی کارروائیاں مکمل کر چکا تو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ فلم کی ہیروئن کے لیے کس لڑکی کا انتخاب کیا جائے۔ مسئلہ دوسروں کا تھا ورنہ وہ تو ثمینہ خاتون کو ہیروئن منتخب کر چکا تھا۔ دوست اسے سمجھا رہے تھے کہ بمبئی میں ایک سے ایک لڑکی پڑی ہوئی ہے لیکن وہ کسی کی بات سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر خوشامدی دوست اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ خوشامدیوں نے اس کی کمزوری کو تاڑ لیا تھا۔ بات بات پر ثمینہ خاتون کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے۔ کرشن کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا انتخاب درست ہے۔ ایسے میں وہ مخلص دوست جو اسے صحیح مشورے دے

رہے تھے، اسے بُرے لگنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ انہیں بھولتا جارہا تھا کہ ثمینہ کو یاد رکھنے کے لیے ان مخلص دوستوں کو بھلانا ضروری تھا۔

اپنی گرم بازاری دیکھ کر ثمینہ بھی اس پر نچھاور ہوئی جارہی تھی۔ کرشن چندر اس پر اپنی دولت بے دریغ لٹارہا تھا۔ ودیاوتی بھی وہیں موجود تھی اور ثمینہ خاتون بھی۔ یہ راز اب راز نہیں رہا تھا۔ ودیاوتی اب گونگی بن چکی تھی لیکن ایک دن اچانک بول پڑی۔ اس کا ساتھ کرشن کی بہن سرلا نے بھی دیا۔ اس معاشقے پر اس کے گھر والے بھی ناخوش تھے لیکن اسے ثمینہ کی کوئی ایسی ادا بھاگئی تھی کہ کسی کی بات سننے پر تیار نہیں تھا۔

ثمینہ خاتون اس کی داد و دہش سے خوب خوب فیض یاب ہو رہی تھی۔

"یہ لڑکی تم سے محبت نہیں کرتی۔"

"یہ لڑکی تمہاری دولت سے پیار کرتی ہے۔"

"تم اسے عروج بخشو گے اور یہ تمہی کو آنکھیں دکھائے گی۔"

"دیکھ لینا ایک دن تمہیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

"تم ایک لڑکی کی خاطر دوستوں کو بھی نظر انداز کر رہے ہو۔" "اس کی قربت میں تمہاری کارکردگی متاثر ہو رہی ہے۔ تم نے بہت دن سے کوئی افسانہ بھی نہیں لکھا۔"

"پچھلے دنوں ایک ادبی کانفرنس ہوئی تھی، تم اس میں بھی نہیں گئے۔ ثمینہ کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہرے رہے۔"

"سرائے کے باہر" کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ مہندرناتھ ہیرو اور ثمینہ ہیروئن تھی۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن کے مصداق فلم کمپنی کی مالک وہی بنی ہوئی تھی۔ جب وہ کرشن کے اعصاب پر سوار ہو چکی تھی تو اسے ڈر کس کا۔ وہ کبھی سیٹ پر آتی کبھی نہیں آتی۔ وہ کسی بات پر برہم ہوتی تو کرشن اپنی حیثیت کا لحاظ کیے بغیر سب کے سامنے اس کی خوشامد کرتا، اس کے ناز اٹھاتا۔

اس کے دوست ٹھیک کہتے تھے۔ ثمینہ کے چاؤ چونچلوں میں ڈھیر سارا وقت ضائع ہو گیا۔ اس کی فلم مقررہ وقت سے بہت بعد میں مکمل ہوئی اور اندازے سے زیادہ رقم خرچ ہو گئی۔ وہ اب بھی خوش تھا کہ اس کی ڈائریکشن میں ایک نظریاتی فلم پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوئی۔ ثمینہ کا دل بھی اس نے جیت لیا۔

یہ ایک نظریاتی کہانی پر مبنی فلم تھی۔ عام آدمی کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ مرچ مسالا بھی اس میں نہیں ڈالا گیا تھا جو کمرشیل فلموں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کچھ کرشن کی ناتجربہ کاری کو بھی دخل تھا۔ لہٰذا یہ فلم بُری طرح فلاپ ہو گئی۔

اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے ایک فلم کی ناکامی کے بعد دوسری فلم کا آغاز کردیا۔ اس فلم کا نام اس نے "راکھ" تجویز کیا۔ قسمت آزما پھر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کام پھر شروع ہو گیا۔ اس فلم کی ہیروئن بھی ثمینہ ہی تھی۔

وہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ قسمت باربار ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ اس کی قسمت اس کا ساتھ ضرور دے گی لیکن بازی اس مرتبہ بھی الٹ گئی۔ یہ فلم بھی فلاپ ہوئی۔

پہلی چوٹ تو وہ سہہ گیا لیکن اس زخم نے اسے بے حال کردیا۔ تینوں گاڑیاں بک گئیں۔ چار نوکروں میں سے ایک نوکر رہ گیا۔ ایک بڑا قرض الگ چڑھ گیا۔

مالی بحران میں مبتلا ہوتے ہی خوشامدی دوستوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ فلمی دنیا کی یہی روایت رہی ہے۔ یہاں جب کسی پر زوال آتا ہے تو کوئی اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس کے قریب آنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ کہیں اس کی نحوست سے ہماری قسمت بھی داغدار نہ ہو جائے۔ وہی ایکسٹرا لڑکے لڑکیاں جو اس کے آگے پیچھے رہتے تھے، دانہ چگنے کہیں اور جاچکے تھے۔

وہ اس وقت ٹوٹ کر بکھر گیا تھا جب ثمینہ بھی اس سے کترانے لگی۔ ملاقاتوں میں وقفے آنے لگے اور پھر تعطل آگیا۔ پھر معلوم ہوا اس نے بحریہ کے کسی افسر سے شادی کرلی پھر معلوم ہوا وہ پاکستان چلی گئی۔

اس دن اسے معلوم ہوا، اس کے دوست ٹھیک کہتے تھے "دیکھنا ایک دن تمہیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

○☆○

دسمبر کا مہینہ ہے۔ دلی میں یوں بھی سردی بہت ہوتی ہے اور رات تو بارش ہو چکی ہے۔ کرشن ابھی باہر نہیں نکلا لیکن اسے یقین ہے کہ باہر کہر پڑ رہی ہوگی۔ وہ ان دنوں دلی آیا ہوا ہے۔ بہت دنوں بعد آرام کرنے کا موقع ملا ہے اس لیے دیر تک سونے کا پروگرام ہے۔

"مجاز صاحب آئے ہیں" اس کی بہن سرلا نے اسے جگانے کے بعد کہا۔

"مجاز آیا ہے؟ یہ کم بخت ہر کام بے تکا کرتا ہے۔ بھلا یہ کوئی وقت ہے آنے کا۔"

"ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے جس کی گود میں بچہ ہے۔"

"ارے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور کوئی گرم چیز اوڑھنے کے لیے دو۔ قلفی جم جائے گی دونوں کی۔"

"آپ تو اٹھیں، میں نے انہیں بٹھا دیا ہے۔"
"تم انہیں گرما گرم چائے پلاؤ، میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

کرشن لحاف سے نکل آیا تھا اور تیار ہو کر سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ عورت کون ہو سکتی ہے۔ مجاز نے کہیں شادی تو نہیں کرلی۔ اگر شادی کر ہی لی ہے تو یہ کون سا وقت ہے گھر سے نکلنے کا۔ پھر خیال آیا، مجاز کسی مصیبت میں نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ بے قرار ہو گیا۔ مجھے گرم سوٹ میں بھی سردی لگ رہی ہے اور مجاز یہاں تک آ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

"ارے مجاز، تم! اتنے سویرے سویرے۔" کرشن نے کہا۔

"سلمیٰ صاحبہ کو آج ہی علی گڑھ پہنچنا ہے اور آپ سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتی تھیں لہٰذا آنا پڑا۔"

"آپ نے ان کا تعارف نہیں کرایا؟"

"یہ سلمیٰ صدیقی ہیں۔ مشہور ادیب رشید احمد صدیقی کی صاحب زادی۔"

"یہ تو رشید صاحب کا تعارف ہو گیا۔ کون ادیب ہوگا جو رشید صاحب کو نہیں جانتا ہوگا۔ آپ تو سلمیٰ کا تعارف کرائیے۔"

"افسانے لکھتی ہیں۔ علی گڑھ میں پڑھاتی ہیں اور خورشید منیر سے ان کی شادی ہو گئی ہے۔"

"اب تعارف مکمل ہوا۔ افسانے لکھتی ہیں اس لیے ہماری برادری کی ہوئیں" کرشن نے کہا اور ہاتھ ملانے کے لیے سلمیٰ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سلمیٰ نے کرشن کی گرم جوشی کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور جواب میں اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا۔

"ارے! کچھ ناراض ہیں آپ ہم سے" کرشن نے کہا۔ اور اپنا ہاتھ سمیٹ لیا۔

مجاز نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا۔

چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے
پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے

"بچہ بڑا پیارا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟" کرشن نے سلمیٰ کی گود سے بچے کو لیتے ہوئے کہا۔

"راشد خورشید منیر" سلمیٰ نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کے شوہر کا نام خورشید منیر ہے؟"

"جی۔"

"یہ وہی خورشید منیر تو نہیں ہیں جو فلموں میں کام کی تلاش میں کچھ دنوں پونا میں بھی مقیم رہے؟"

"جی ہاں۔ شادی کے بعد وہ مجھے بھی پونا لے گئے تھے۔"

ڈرامے

دروازہ، حجامت، نیل کنٹھ، قاہرہ کی ایک شام، بے کاری، سرائے کے باہر۔ بدصورت راجکماری، جھاڑو، ہم سب غلیظ ہیں، عشق کے بعد، کتاب کا کفن، نقش فریادی۔

رپور تاژ۔ پودے، صبح ہوتی ہے۔

بچوں کی کتابیں

۱۔ الٹا درخت ۲۔ بیوقوفوں کی کہانیاں ۳۔ سونے کی صندوقچی ۴۔ چڑیوں کی الف لیلہ ۵۔ شیطان کا تحفہ ۶۔ سونے کا سیب ۷۔ لال تاج ۸۔ ستاروں کی سیر ۹۔ خرگوش کا سپنا ۱۰۔ ہمارا گھر ۱۱۔ بہادر یار جنگ۔

مرتب شدہ کتابیں۔

نئے زاویے (حصہ اول، دوم)
پل کے سائے میں۔

"میں ان دنوں پونا سے بمبئی آ چکا تھا ورنہ بہت پہلے ملاقات ہو چکی ہوتی۔"

"قسمت میں تھا کہ اس وقت ملاقات نہ ہو۔"

"ایک بات بتاؤں" مجاز نے سرگوشی میں کہنا شروع کیا "ان کا حال بھی آپ سے مختلف نہیں ہے۔ آپ کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی، ان کی اپنے شوہر سے نہیں بنتی۔"

کرشن نے دیکھا کہ سلمیٰ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ شاید مجاز کا یہ تبصرہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔

کرشن نے بڑی ہوشیاری سے بات کا رخ موڑ دیا "آپ کی ساڑی کا رنگ جوگیا ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"مجھے بہت پسند ہے یہ رنگ۔ یہ رنگ مجھے سن کیسر کے پھولوں کی یاد دلاتا ہے۔"

"سن کیسر کون سا پھول ہوتا ہے؟"

"کمال ہے، آپ نے سن کیسر کا پھول نہیں دیکھا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ آپ بمبئی آئیں گی تو ہم آپ کو سن کیسر کے پھول دکھائیں گے۔"

مجاز نے ہنس کر پوچھا "تم ان کو بمبئی بلا رہے ہو؟"

"بمبئی تو ان کو آنا ہی پڑے گا" کرشن نے اتنے یقین سے کہا جیسے کسی ہمدم دیرینہ کو بمبئی آنے کی دعوت دے رہا ہو۔

اس کے لہجے میں خلوص اور لفظوں میں اپنائیت کا رنگ تھا۔ سلمیٰ کا تکلف ختم ہو گیا تھا لیکن وہ خاموش تھی۔

چائے ابھی ابھی آئی تھی۔ مجاز چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ کرشن چندر افسانہ نگار کی آنکھ سے سلمیٰ کا جائزہ لے رہا تھا۔ دراز قامت، صبیح رنگت، بھرا پرا جسم، موٹی موٹی سیاہ روشن آنکھیں جو اس کی ساری شخصیت پر چھائی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کرشن کو اچانک محسوس ہوا، وہ جس چہرے کی تلاش میں اب تک بھٹکتا رہا ہے، وہ چہرہ اسے آج ملا ہے۔

"اب یہ کہنا تو فضول ہے کہ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں" سلمیٰ نے کہا۔

"کبھی کبھی معقول آدمی کو فضول باتیں بھی کرنی چاہئیں۔"

"تو آپ چاہتے ہیں، آپ کی تعریف کی جائے؟"

"اس کے بعد ہی تو میں آپ کی تعریف کرسکوں گا۔"

"آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔"

"اب اور اچھا لکھوں گا۔"

"کیوں؟ اب کیا بات ہوگئی؟"

"ایک دوست کی تلاش تھی۔ وہ مل گیا ہے لہٰذا اس خوشی میں لکھوں گا۔"

"آپ جتنا لکھیں گے ہمارے ادب کی تاریخ بنے گا۔"

"اگر آپ کا جانا ضروری نہ ہو تو کچھ دن ہمارے گھر مہمان رہیے۔"

"آپ کی مہمان نوازی کے بڑے قصے سنے ہیں لیکن میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

"خط تو لکھیں گی؟"

"بہت چور ہوں۔"

"چوری چوری ہی لکھ دیا کیجئے گا۔"

سلمیٰ کو بے اختیار ہنسی آگئی "اب میری عمر چوری کی نہیں ہے۔"

"بے شک! سینہ زوری کی ہے" مجاز نے فقرہ چست کیا۔

"اگلی مرتبہ آیئے تو مجاز کو ساتھ نہ لایئے گا۔"

یہ کرشن سے سلمیٰ کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد سلمیٰ علی گڑھ چلی گئی اور کرشن بمبئی واپس لوٹ گیا۔

بمبئی میں اب اس کے لیے خاک اڑ رہی تھی۔ اس کی جیب خالی تھی۔ سر پر بھاری قرض تھا جسے اتارنا تھا۔ فلم پروڈکشن کے دوران میں ادب سے اس کا ناتا تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔ اسے استوار کرنا تھا۔ فلمی دنیا میں نئے رابطے بنانے تھے۔ زندہ رہنے کے لیے ازسرِ نو تگ ودو کرنی تھی۔ بمبئی پہنچتے ہی اس نے ایک نئے جذبے کے ساتھ نئی زندگی شروع کی۔ اب اس کے ساتھ سلمیٰ کا خیال بھی تھا جو ہروقت اس کا حوصلہ بلند رکھتا تھا۔

اب اسے اپنے زوال کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ جب میرے پاس دولت تھی اس وقت سلمیٰ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اب خالی ہاتھ ہوں، اسے کیا دے سکوں گا۔ کاش! میں نے وہ دولت بچا کر رکھی ہوتی۔ جائداد بنالی ہوتی۔ میں تو کم از کم پانچ فلیٹ شراب میں ڈبو کر پی گیا۔ یہ بمبئی ہے! یہاں گاڑی میں سوار، پیدل چلنے والے کو نہیں دیکھتا۔ یہاں دو طبقے ہیں، لکھ پتی یا فقیر۔ ان کے درمیان کوئی نہیں رہتا۔ مجھے یہ بات پہلے سوچنی چاہیے تھی۔

مایوسی کے یہ فقرے اس کے ذہن میں گونجتے ضرور تھے لیکن اسے اپنے قلم پر اعتماد تھا۔ وہ اس رفتار سے لکھتا تھا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ جتنی دیر میں کوئی ادیب دانتوں میں قلم دبا کر سوچنے کے عمل سے گزرتا ہے، وہ افسانہ مکمل کرلیتا تھا۔ تیز رفتاری میں اگر کوئی اس کا حریف تھا تو وہ تھا منٹو۔ وہ پاکستان جاچکا تھا۔ ہندوستان بھر میں کرشن اکیلا تھا۔

کوور لاج میں لگے ناریل اور تاڑ کے درخت اب بھی اسی طرح ہرے بھرے تھے۔ پرندے اب بھی بولتے تھے۔ کرشن اوپر کی منزل پر بیٹھا اپنے نیلے کاغذ کے پیڈ پر افسانے لکھتا رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ افسانے لکھ کر مجموعے شائع کرائے تاکہ ان سے ملنے والی رقم سے گھر کا خرچ چلا سکے۔ ایک مقدس سناٹا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔

ہندوستان میں طبقاتی کشمکش ابھی ختم نہیں ہوئی۔ سرمایہ داری کا سانپ اب بھی پھن کھولے کھڑا ہے۔ معاشی زندگی مسلسل ناہموار چلی آرہی ہے۔ مارواڑی سیٹھوں کی ذہنیت وہی ہے، مزدور طبقے کی زندگی بھی اب تک وہی ہے۔ اس کا کشمیر ابھی تک بھوک اور افلاس کا شکار ہے۔ زندگی تلخ ہے۔ سماج جابر ہے۔ عوام استحصال کا شکار ہیں۔ دہقان کے پاؤں ننگے ہیں۔ نسوانی حسن چیتھڑوں میں ملبوس ہے۔ خواہشیں قیدی ہیں۔ جذبے مردہ ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شام سہانی ہے۔ رات نشہ بار ہے اور برف چاندی کی طرح چمکتی ہے۔ اور پھول بوسوں کی طرح دہکتے ہیں۔

اس کے اس دور کے افسانے انہی دونوں موسموں کا امتزاج پیش کررہے تھے یعنی رومان اور حقیقت کا امتزاج۔ اس کے اندر ایک شاعر چھپا ہوا تھا جو اس کی رومانی کیفیات کا نمائندہ تھا اور اس کا افسانہ نگار اردگرد بکھری ہوئی تلخ حقیقتوں سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک اور چیز تھی اور وہ

تھی اس کے مزاج کی فطری شوخی جو اس کے افسانوں میں طنز و مزاح کے رنگ شامل کردیتی تھی۔

ان تینوں خصوصیات کا یک جا ہوجانا اسے دیگر افسانہ نگاروں سے منفرد ثابت کررہی تھیں۔

وہ ان افسانوں کو مختلف رسائل میں بھیج کر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتا رہا۔ اس کی واپسی ادب کے لیے خوش آئند تھی۔ اس کے پڑھنے والوں نے اس کا استقبال کیا۔ نقادوں نے خیر مقدم کیا۔ اس کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ اس کے فن پر تبصرے کیے جانے لگے۔ ترقی پسند ادب کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے اس کی مثال پیش کی جانے لگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کئی افسانوی مجموعے پڑھنے والوں کے سپرد کردیے۔ "میں انتظار کروں گا' مزاحیہ افسانے' ایک روپیہ ایک پھول' یوکلپٹس کی ڈالی' ہائیڈروجن بم کے بعد' نئے افسانے۔"

اس فرصت سے فائدہ اٹھاکر اس نے ایک ناول "طوفان کی کلیاں" بھی شائع کرادیا۔

اس کی ان تخلیقی کاوشوں نے جہاں اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا' اس کا ادبی قد بڑھایا وہیں ان کتابوں سے ملنے والی رائلٹی نے اس کی مالی مدد بھی کی۔

قدرے تگ ودو کے بعد اسے فلمی کام بھی ملنے لگا اور یوں اس کی زندگی کی ناؤ ہچکولے کھانے کے بعد سنبھلنے لگی۔

سلمٰی سے دوسری ملاقات کا موقع نصیب نہیں ہوسکا تھا۔ یہ موقع بھی قسمت سے نکل آیا۔

کرشن کے سب سے چھوٹے بھائی اوپندر ناتھ کی شادی تھی۔ اسے انتظامات کے لیے دلی آنا پڑا۔ خوشی کا یہ موقع ہو اور وہ سلمٰی کو یاد نہ کرے؟ اس نے دعوت نامہ سلمٰی کو روانہ کردیا۔

دلی کے تیس ہزاری والے مکان کے سامنے شامیانہ لگا ہے۔ برات سجائی جارہی ہے۔ ڈھولک پر گیت گائے جارہے ہیں۔ لڑکیاں ہنسی مذاق کررہی ہیں۔ برات کا گھر ہے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے۔

کرشن چندر یہ دیکھنے کے لیے کہ سلمٰی آئی یا نہیں کبھی شامیانے میں آتا ہے اور کبھی باہر آجاتا ہے۔ بالآخر سلمٰی اسے نظر آگئی۔ رسمی سی گفتگو ہوئی۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھی گئی کیونکہ اس وقت سلمٰی عورتوں میں گھری کھڑی تھی اور دلچسپی سے یہاں ہونے والی رسموں کو دیکھ رہی تھی۔

کرشن کو اس سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں لیکن موقع نہیں مل رہا ہے۔ اس کی آنکھیں مسلسل سلمٰی پر لگی ہوئی ہیں۔

سلمٰی جونہی اکیلی ہوئی وہ وہاں پہنچ گیا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے شامیانے کے ایک گوشے میں پہنچ گئے۔

"آج آپ نے جوگیا ساڑی کیوں نہیں پہنی؟" کرشن اسے یاد دلا رہا تھا کہ اسے پہلی ملاقات ابھی تک یاد ہے۔

"میرے پاس کیا صرف ایک ہی ساڑی ہے کہ بس اسی کو پہنتی رہوں" سلمٰی نے اٹھلاتے ہوئے کہا اور کرشن بے اختیار ہنس پڑا۔

"ارے بُرا مان گئیں۔ یہ گلابی ساڑی بھی آپ پر خوب سج رہی ہے۔ آئندہ بھی یہی رنگ پہننا پڑے گا۔"

"میں تو آپ کو کہانی کار سمجھتی تھی۔ آپ تو ساڑی ڈیزائنر نکلے۔"

"یہ انکشاف مجھ پر خود آپ سے ملاقات کے بعد ہوا ہے۔ دراصل انسان میں بہت سی باتیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسے خود معلوم نہیں ہوتا۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کس کو کس وقت ظاہر ہونا ہے۔ رنگوں کا یہ احساس شاید میری فطرت میں ودیعت کیا تھا جو آپ سے ملاقات کے بعد خود بخود ظاہر ہوگیا۔ اب آپ خوشی سے مجھے ساڑی ڈیزائنر کہہ سکتی ہیں۔"

"آپ نے تو میرے مذاق کو بھی اچھا خاصا فلسفہ بنادیا" سلمٰی نے کہا۔

"اس سے آپ اندازہ لگاسکتی ہیں کہ میں کتنا سنجیدہ ہوں۔ آپ کا مذاق بھی میرے لیے سنجیدگی ہے۔ اندازہ کیجیے جب آپ سنجیدہ ہوجائیں گی تو مجھ پر کیا گزرے گی؟"

"آپ کا نیا افسانہ پڑھا تھا" سلمٰی نے بات کا رخ موڑنے کے لیے یہ ذکر چھیڑ دیا۔

کرشن اس وقت اپنے اور سلمٰی کے درمیان کسی کو لانا نہیں چاہتا تھا۔ چاہے وہ ادب ہی کیوں نہ ہو۔

"وہ لڑکی جو بالوں میں پھولوں کا گجرا سجائے ہنستی جارہی ہے' میری بھاوج ہے۔"

"ملاقات ہوچکی ہے۔"

"لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا ہوگا کہ یہ مہاراشٹرین ہے۔ مہاراشٹر میں گجرے کو وینی کہتے ہیں۔"

"اچھا!"

"آپ بمبئی آئیں گی تو آپ بھی اپنے بالوں میں ایسی ہی وینی سجایا کیجیے گا۔"

"آپ نے کیسے طے کرلیا کہ میں بمبئی آؤں گی؟"

"تو کیا آپ نے ابھی تک طے نہیں کیا؟ بمبئی تو آپ کو آنا ہی پڑے گا۔"
"چلیے آجائیں گے کبھی گھومنے کا موڈ ہوا تو۔"
"جی نہیں۔ گھومنے کے لیے نہیں۔ کبھی آیئے گا تو مستقل رہنے کے لیے آیئے گا۔"
"بھلا میں بمبئی میں مستقل کیوں رہنے لگی۔"
"جب آپ بمبئی آؤ گی تو سن کیسر کے پھول کے رنگ کی ساڑی پہننا' گلابی رنگ کی ساڑی پہننا' بالوں میں وینی (گجرا) سجانا" کرشن نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "میں وہاں ایک اور گھر بناؤں گا جہاں تم آکر اترو گی۔"
اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ بات بطور عارضی مہمان بمبئی آنے کی نہیں بلکہ مستقل طور پر رہنے کی ہے۔ سلمٰی نے بھی اس کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ اس کی خاموشی نیم رضامندی کو ظاہر کررہی تھی۔
سلمٰی تو دوسرے ہی دن واپسی کا ارادہ کررہی تھی لیکن کرشن نے اسے ضد کرکے روک لیا۔
"بھئی' تمہارے ساتھ بیٹھ کر پینے میں لطف آئے گا۔"
"آپ پی کر بہکتے تو نہیں ہیں؟"
"جو ہوش میں نہیں بہکتا وہ مدہوشی میں کیا بہکے گا۔ میں تو پینے کے لطف کی بات کررہا تھا۔"
"پھر کوئی حرج نہیں۔"
"آپ شراب کو برا نہیں سمجھتیں؟"
"اچھا آدمی اچھا ہی رہتا ہے' پینے کے بعد بھی۔"
"آپ کتنی روشن خیال ہیں۔ مجھے ایسی ہی ساتھی کی ضرورت تھی۔"
"اس میں روشن خیالی کی کیا بات ہے۔ آپ ادیب ہیں' یہ سب تو چلتا ہے مگر جو بھی ہو اعتدال سے ہونا چاہیے۔"
"میں نے زندگی میں بہت سے عشق لڑائے ہیں۔ کیا تمہیں علم ہے؟"
"مجھے کیسے علم ہوسکتا ہے۔ ویسے کچھ بعید بھی نہیں۔ آپ کتنے ہی دلوں میں آباد ہیں۔"
"آپ کے دل میں بھی؟"
سلمٰی کچھ دیر کے لیے بوکھلا گئی "اگر میرے دل میں آپ کے لیے جگہ نہ ہوتی تو میں مجاز کے ساتھ آپ سے ملنے آپ کے گھر نہ آتی۔"
"اس کا مطلب ہے۔۔"
"اس کا مطلب ہے آپ بہت اچھے انسان ہیں۔"
دھنک کے ساتوں رنگ کتنی ہی دیر تک میڈن ہوٹل دہلی کی چھت پر اترے رہے جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔
"میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ عشق جو میں لڑاتا رہا' اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف تھے۔ میں ایک صورت کی تلاش میں تھا جس کی محبت کے بغیر میرے دل کا آئینہ مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اب وہ چہرہ مجھے مل گیا ہے۔ اب میری تلاش ختم ہوگئی ہے۔ محبت کا مفہوم بہت دیر سے میری سمجھ میں آیا۔"
"چلیں' بہت دیر ہوگئی ہے۔ گھر پر سب لوگ ہمارا انتظار کررہے ہوں گے۔"
"آپ بات کا رخ کیوں موڑ رہی ہیں۔ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"
"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔"
"بس' مجھے میری بات کا جواب مل گیا۔ آیئے چلیں۔"
وہ سلمٰی کو لے کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اس وقت دونوں' ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ ایک جواب یہ بھی تھا۔
گھر میں واقعی ان کا انتظار ہورہا تھا۔ کرشن کی والدہ کھانے پر ان کا انتظار کررہی تھیں۔
"یہ تو دیر سے کھانا کھاتا ہے۔ بیٹی' تم کھانا کھالو۔"
"ماں جی' ہم نے ہوٹل میں الٹی سیدھی چیزیں اتنی کھالیں کہ بھوک نہیں رہی۔ میں بھی دیر سے کھاؤں گی۔"
سلمٰی کو معلوم تھا کہ وہ دیر سے کھانا کیوں کھاتا ہے۔ ہر رات شراب پینا اس کے لیے لازمی ہے۔ شراب سے نمٹ کر ہی کھانا کھاتا ہوگا۔ اس نے کہا تھا' تمہارے ساتھ بیٹھ کر پینے میں لطف آئے گا۔ میں اسے پیتے ہوئے دیکھوں گی اور پھر اسی کے ساتھ کھانا کھاؤں گی۔
کرشن چندر پینے بیٹھا تو اس کے سامنے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ' مہذب اور نہایت شائستہ گفتگو کرنے والی ایک خاتون بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی سرلا کمرے میں آجاتی تھی۔ کرشن آج نہایت شگفتہ موڈ میں تھا۔ عام طور پر وہ چار پیگ سے زیادہ نہیں پیتا لیکن آج اس نے دو پیگ زیادہ پی لیے۔
"بس کیجیے۔ آپ چھ پیگ پی چکے ہیں" سلمٰی نے اسے ٹوکا۔
"کیا خبر' تمہارے ساتھ بیٹھنا کب نصیب ہو۔ سوچتا ہوں جتنی پینی ہے آج پی لوں۔"
"بس کیجیے۔ ایسے مواقع پھر بھی آئیں گے۔"
"وعدہ؟"

"وعدہ رہا۔"

"چلو' پھر ٹھیک ہے۔ سرلا سے کہو کھانا لے آئے۔ تم بھی میری وجہ سے بھوکی بیٹھی ہو۔"

سرلا کھانا لے آئی اور دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اس نے سرلا کی مدد سے کرشن کو اس کے کمرے میں پہنچایا اور خود سرلا کے ساتھ بستر پر دراز ہو گئی۔

"کرشن جی کی ان کی بیوی سے کیوں نہیں بنتی؟" سلمیٰ نے سرلا سے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو دیدی! کرشن بھیا کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ ودیا بھابی ان کے لائق نہیں ہیں۔ اب تو ماتا جی کو بھی افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے کیسی لڑکی کا ہاتھ بھیا کے ہاتھ میں تھما دیا۔"

اس کے بعد نہ سرلا نے کچھ کہا نہ سلمیٰ نے کچھ پوچھا۔ شاید دونوں سو گئی تھیں' شاید دونوں نہیں سوئی تھیں۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد سلمیٰ اس گھر سے روانہ ہو گئی جیسے سخت سردی ہو اور دھوپ رخصت ہو جائے۔

سلمیٰ صدیقی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جانی پہچانی ادیبہ تھی اور اس کا خاندان علی گڑھ ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

کرشن چندر کا شمار بھی چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ عوام وخواص میں اس کی نگارشات کو قبولیت حاصل تھی۔

دونوں اپنی اپنی ازدواجی زندگی سے نامطمئن اور نالاں تھے۔ کرشن کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی تھی' سلمیٰ کی گھریلو زندگی اپنے شوہر کی وجہ سے ناآسودہ تھی۔ دونوں گردشِ دوراں کے ستائے ہوئے تھے اسی لیے ذہنی طور پر جلد ہی دونوں میں گہری ہم آہنگی ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد گھر میں کیا رہ گیا تھا۔ سب تھے لیکن تنہائی تھی۔ وہ اس تنہائی سے اکتا کر بمبئی واپس لوٹ گیا۔

○☆○

کرشن کی چھوٹی بیٹی الکا جب چھٹی جماعت میں تھی تو اچانک اس کے دماغ میں فتور پیدا ہو گیا۔ کچھ دنوں تو حالت قابلِ برداشت رہی۔ بس بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگتی تھی یا رونے لگتی تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی حالت بگڑتی گئی۔ اس دوران میں علاج بھی ہوتا رہا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہو سکا۔ اس مرتبہ جو وہ دہلی سے بمبئی لوٹا' تو الکا کے بجائے ایک مکمل پاگل لڑکی کے وجود نے اسے دہلا دیا۔ اب اس کا پاگل پن تشدد پر اُتر آیا تھا۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی تھی۔ کچھ نہیں تو اپنے بال نوچتی تھی۔ اسے رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔

جوان لڑکی پاگل ہو جائے اور وہ بھی ایسی کہ گالیاں بکتی رہے' مار پیٹ پر اُتر آئے۔ کرشن کے لیے کیا کسی باپ کے لیے بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔

کرشن ہر مشکل سے لڑتا رہا تھا لیکن بیٹی کی حالت نے اسے توڑ دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"نہ جانے میں نے کون سا پاپ کیا ہے۔ جس کی سزا میری بچی کو مل رہی ہے۔"

بمبئی بڑا شہر تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر موجود تھے۔ ہر سہولت حاصل تھی۔ وہ اپنی بچی کو لے کر ایک ایک ڈاکٹر کے دروازے پر گیا' ہر اسپتال کی خاک چھانی۔ جتنی جمع پونجی تھی سب اس بچی کے علاج پر لگا دی لیکن بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ یہ احساس کہ الکا کا مرض لاعلاج ہے' اس کے لیے اذیت ناک احساس تھا۔

بمبئی کا ہر ڈاکٹر ایک ہی نتیجے پر پہنچا تھا کہ الکا کو رانچی کے پاگل خانے میں داخل کرا دیا جائے۔

اس مایوسی کے بعد کرشن کا دل گوارا نہیں کرتا تھا کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو پاگل خانے کے حوالے کر دے۔

اسے کسی نے بتایا کہ دہلی کے پاگل خانے میں ایک نیا ڈاکٹر امریکا سے آیا ہے۔ وہ الکا کو دہلی لے گیا۔ اپنے کام کاج چھوڑ کر وہ دہلی میں پڑا رہا۔ سلمیٰ بھی ایک دو مرتبہ عیادت کے لیے دہلی آئی' احباب بھی ہر دلداری ہر مدد کے لیے موجود تھے لیکن کرشن کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ حساس فنکار تھا۔ بیٹی کے غم میں خود اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ الکا تو ڈاکٹروں کے حوالے تھی اور وہ دن دن بھر سڑکوں پر نظر آتا تھا۔ ناشروں کے دفتروں کے چکر کاٹ رہا تھا' ان ملنے والوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا جو علاج کے لیے رقم کا بندوبست کر سکتے تھے۔ اس کے لباس پر کبھی شکن نہیں ہوتی تھی' اب اسے لباس بدلنے کا ہوش نہیں تھا۔ احباب کو یہ فکر تھی کہ کہیں بیٹی کے بعد باپ بھی پاگل نہ ہو جائے۔

ڈیڑھ مہینے کے مسلسل علاج کے بعد یہاں کے ڈاکٹروں نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ اسے رانچی کے پاگل خانے میں داخل کرا دیا جائے۔

اس نے ضروری رقم کا بندوبست کیا اور الکا کو لے کر رانچی پہنچ گیا۔ اس کے افسانہ نگار دوست یہاں بھی موجود تھے۔ رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک دوست کے گھر

ٹھہرا اور الکا کو لے کر رانچی کے پاگل خانے پہنچ گیا۔

ڈاکٹروں نے رائے دی کہ مریضہ کی حالت پر دو ماہ تک تحقیق ہوگی اور اس کے بعد مستقل طریقۂ علاج کی بابت فیصلہ کیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپریشن کرنا پڑے۔

کرشن نے الکا کو اسپتال کے حوالے کیا اور خود بمبئی واپس آگیا۔

وہ تو قلم سے روزی کمارہا تھا۔ ان پریشانیوں میں مبتلا ہوا تو فلمی کام بھی بند ہوگیا' ادبی کام بھی۔ جب دماغ ہی بند ہو تو تخلیق کا دروازہ کیسے کھلے۔

نہ لکھتا تو گھر کیسے چلتا' الکا کا علاج کیسے ہوتا۔ وہ آنسوؤں کو روشنائی بنا کر پھر لکھنے بیٹھ گیا۔

ان دنوں کوور لاج میں بڑا ہیبت ناک سناٹا تھا۔ ودیاوتی اپنی خالی خالی آنکھوں سے دیواروں کو تکتی رہتی تھی۔ الکا کی بڑی بہن کپیلا' بہن کو یاد کرکے روتی رہتی تھی۔ سلمٰی کے خط آرہے تھے لیکن وہ خود بمبئی نہیں آئی۔ کرشن کو یہ دکھ بھی تھا۔

ابتدائی رپورٹیں حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ اب الکا کو مکمل صحت یابی تک رانچی کے پاگل خانے میں رہنا تھا۔

اس ناگہانی افتاد نے اسے صرف جذباتی صدمہ نہیں پہنچایا تھا بلکہ وہ مالی طور پر بھی زیر بار ہوا تھا۔ اسے یہ نقصان پورا کرنا تھا۔ وہ سخت محنت کررہا تھا۔ اس جدوجہد میں طویل عرصے تک وہ سلمٰی سے نہیں مل سکا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے خیال سے غافل رہا ہو۔

اسے معلوم تھا کہ علی گڑھ کے گرلز کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئی ہوں گی۔ اس نے سلمٰی کو لکھا کہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے کسی پہاڑی مقام پر چلا جائے اور وہ مسوری پہنچ گئے۔

اس کے بعد تو ہر جگہ سلمٰی اور کرشن ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے۔ عالمی میلے' وگیان بھون دہلی میں ہونے والے سیمینار' کوی سمیلن' وزرا اور امرا کے ڈنر' ہر جگہ وہ اور سلمٰی ایک ساتھ نظر آتے تھے۔

اب ان کا عشق کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ممکن ہے اس کے گھر والوں کو بھی علم ہو۔ سلمٰی کسی احتیاط کا خیال نہیں رکھ رہی تھی۔ کرشن بڑا افسانہ نگار تھا اور وہ اس کی ادبی پرستار۔ کم از کم وہ ہر پوچھنے والے سے یہی کہتی تھی لیکن بات اس سے کہیں آگے جاچکی تھی۔

دھند میں لپٹی ہوئی شامیں' چاندنی راتیں' نور میں نہائی ہوئی صبحیں۔ کون سے لمحات تھے جو انہوں نے ایک ساتھ نہیں گزارے۔ ادبی تقریبات کے بہانے وہ دونوں شہروں شہروں گھومتے رہے' ہوٹلوں میں ٹھہرتے رہے۔ حرفِ مطلب بار بار زبان پر آیا لیکن دونوں ایک کیسے ہوسکتے تھے۔ وہ دونوں تو دریا کے دو کنارے تھے۔ ایک ہندو' ایک مسلمان۔

سلمٰی تو اب یہ سوچنے لگی تھی کہ جتنی دور وہ آگئی ہے بس وہی بہت ہے' واپس لوٹ جائے۔ برسوں پر پھیلا ہوا یہ سفر تشنہ ہی سہی' محبتیں یوں بھی تو ہوا کرتی ہیں۔ وہ یہ سوچ رہی تھی لیکن کرشن چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اسے اپنے جذبۂ عشق پر کامل بھروسا تھا۔ وہ سلمٰی کو رفیقۂ حیات بنانے پر مصر تھا۔ سلمٰی کے بار بار انکار کے باوجود وہ بضد تھا۔

اس نے اپنے فیصلے کے پہلے مرحلے میں اپنی بیوی ودیاوتی اور بچوں کو بمبئی میں چھوڑا اور بمبئی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ یہ اس کے طوفانی عشق کا پہلا ہیجانی فیصلہ تھا۔

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ سلمٰی سے شادی کرنے کے بعد بمبئی سے دور جہاں اس کی بیوی رہتی ہے' دلی میں رہے گا۔ دلی پہنچتے ہی اس نے ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں اپنے مربی لالہ کشن لال کے توسط سے ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

اس کی یہ ساری کارروائیاں یک طرفہ تھیں۔ ابھی سلمٰی کی طرف سے رضامندی کا اشارہ نہیں ملا تھا۔ کرشن کو اپنے جذبے پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی رضا کو سلمٰی کی رضا سمجھتا تھا۔

اب ان دونوں کی ہر ملاقات کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے ہورہی تھی۔ دونوں کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ یہ مجبوریاں اتنی پیچیدہ تھیں کہ دو عقل مند انسان انہیں سلجھانے میں لگے ہوئے تھے لیکن یہ الجھتی چلی جارہی تھیں۔

سلمٰی کا شوہر تھا جس سے طلاق لینے کا مسئلہ درپیش تھا۔ کیا خبر اس میں کیسی کیسی جگ ہنسائی ہو۔ بیٹا تھا۔ طلاق کے بعد اسے اپنی تحویل میں لینے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ ماں باپ' خاندان والوں کے دباؤ اور سخت مزاحمت کا سامنا۔ پھر مذہب کی سنگین دیوار حائل تھی۔ زمانہ کیا کہے گا۔ کرشن گمنام آدمی نہیں ہیں۔ ان کی شادی کی دھوم پورے برِصغیر میں مچے گی۔

کرشن چندر کے سامنے بھی کم سوال نہیں تھے۔ اس کی بیوی موجود تھی جس سے ہندو قانون کے مطابق طلاق نہیں ہوسکتی تھی۔

ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کا انتظام بھی کرنا تھا۔ کیا وہ دو گھروں کے اخراجات

کا کفیل ہو سکے گا؟ مذہب کا سوال اس کے سامنے بھی تھا' کیا سلمٰی اپنا مذہب تبدیل کر سکے گی؟ دو یا دتی کے ردِ عمل کا سامنا کر سکے گا؟

یہ سوال کئی مرتبہ ان دونوں کے سامنے آئے تھے اور ہر مرتبہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر دم توڑ گئے تھے۔ سلمٰی کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ سخت اذیت سے گزر رہی ہے اور امکانی پریشانیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی ہے لیکن وہ ہر جنگ لڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ساری کشتیاں جلادی تھیں۔ بمبئ کو خیرباد کہہ کر دہلی میں ڈیرا جمالیا تھا۔ اب وہ واپس بمبئ جانا نہیں چاہتا تھا۔

کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے سلمٰی کو لکھنؤ بلالیا۔

لکھنؤ کے کارلٹن ہوٹل میں اس کا کمرا ایک تھا۔ وہ سلمٰی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ سلمٰی کو علی گڑھ سے آنا تھا۔ شہر میں کسی ادیب کو معلوم نہیں تھا کہ کرشن آئے ہوئے ہیں ورنہ اس کے کمرے میں بھیڑ لگ جاتی۔

وہ اسے لینے اسٹیشن بھی نہیں گیا تھا۔ آج وہ پہلی مرتبہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی سلمٰی کو اس کے ساتھ دیکھے۔

سلمٰی کو رات کی گاڑی سے آنا تھا۔ سب انتظامات اسی لیے تھے کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ وہ گرم کپڑوں میں لپٹا' کارلٹن ہوٹل کے وسیع و عریض ہال میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ہزار وسوسے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ نہ آئے اور وہ آگئی۔ ٹیکسی سے اُترنے والی عورت سلمٰی ہی ہو سکتی تھی اور وہ سلمٰی ہی تھی۔

"شکر ہے تم آگئیں۔"

"ہو سکتا ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اب راستے میں تو مت لڑو۔"

"آؤ' کمرے میں چلتے ہیں۔"

دونوں باتیں کر رہے تھے لیکن دونوں کے لہجے مفلس کے چراغ کی طرح بجھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر کمرے میں بیٹھ کر باتیں ہوتی رہیں' اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوٹل کے لان میں نکل آئے۔ پورے دنوں کے چاند نے اُداس چاندنی کا تحفہ بھیجا ہے۔

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے" کرشن نے پوچھا۔

"ہاں' یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"کوئی فیصلہ آخری فیصلہ نہیں ہوتا" کرشن نے مضبوط لہجے میں کہا "جس طرح کوئی قتل آخری قتل نہیں ہوتا۔"

"نہیں' یہ کسی طرح ممکن نہیں۔"

"بیوقوف نہ بنو" کرشن نے پیار سے اسے ڈانٹا "مجھے زندگی کا تجربہ تم سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم ضرور اکٹھے رہیں گے' رہ سکتے ہیں۔"

"بڑی کٹھنائیاں ہیں۔"

"کٹھنائیاں کہاں نہیں ہوتیں؟"

"دنیا کیا کہے گی؟"

"دنیا نے کب کسے کیا نہیں کہا۔"

"میرا بھی ایک بچہ ہے۔ تمہارے بھی بچے ہیں۔"

"محض اتنا ہی نہیں۔ تمہارے بھی ماں باپ ہیں اور میری بھی ماں ہے۔ تمہارا بھی ایک پتی ہے اور میری بھی ایک پتنی ہے۔ تمہارا بھی ایک دھرم ہے اور میرا بھی ایک دھرم ہے۔"

"تو یہ کیا معمولی باتیں ہیں؟"

"میرے پیار کے سامنے سب معمولی باتیں ہیں۔"

"میں مسلمان ہوتے ہوئے ایک ہندو سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟"

"تو تم ہندو ہو جاؤ۔"

"یہ میں نہیں کر سکتی۔"

"تو میں مسلمان ہو جاتا ہوں۔ تم جانتی ہو مذہب میرے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ میں ایک لبادہ اتار کر دوسرا پہن لوں گا۔"

"کرشن اس کے علاوہ بھی کئی مسئلے ہیں۔ دنیا نہیں مانے گی کہ تم مسلمان ہو گئے۔"

"نہ مانے مگر میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"کرشن' میں کس کس سے لڑوں گی۔"

"میں جو ہوں تمہارے ساتھ۔"

"تمہاری بیوی؟"

"وہ تمہارے ساتھ نہیں رہے گی۔ وہ میرے ساتھ نہیں رہے گی۔ اتنے دن میں اکیلا رہا ہوں' اب وہ اکیلی رہے گی۔"

سلمٰی کے دل کا پتھر پگھلنے لگا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

"پھر کیا سوچا۔"

"میں خورشید منیر سے طلاق لے لوں گی۔"

"اور تمہارے گھر والے؟"

"جب میں نے سوچ ہی لیا ہے تو پھر جو بھی ہو۔"
"مجھے تم سے یہی امید تھی۔"
جس خاموشی سے سلمیٰ آئی تھی، صبح ہوتے ہی اسی خاموشی سے رخصت ہو گئی۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہوسکا کہ اس ایک رات میں کتنا بڑا فیصلہ ہو گیا۔
سلمیٰ اپنے قول میں سچی نکلی۔ اس نے اپنے شوہر سے باقاعدہ طلاق لے لی اور بچے کو اپنی تحویل میں لے لیا اور کرشن چندر کو اطلاع دے دی۔
کرشن چندر نے بھی اپنی بیوی اور گھر والوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔ اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ بچوں کی دائمی کفالت اس کی ذمے داری تھی۔
سلمیٰ نے اپنا فیصلہ اپنے گھر والوں کو سنایا تو قیامت آگئی۔ رشید احمد صدیقی کسی قیمت پر اس کے فیصلے کو ماننے کو تیار نہیں تھے لیکن اس نے اپنی ماں کو یہ کہہ کر مطمئن کرلیا کہ کرشن چندر اس کے لیے اپنا مذہب چھوڑنے پر تیار ہیں۔
آخر وہ ساعت آپہنچی۔ سلمیٰ اپنی والدہ کے ساتھ نینی تال پہنچ گئی۔۔ جہاں یہ شادی ہونے والی تھی۔
سلمیٰ کی والدہ نے نینی تال پہنچتے ہی یہ شرط رکھ دی تھی کہ شادی اسلامی رسوم کے مطابق ہوگی۔ کرشن کو کب انکار تھا۔ پہلے اس کا اسلامی نام "اللہ رکھا" رکھا گیا جو اسے پسند نہ آیا۔ پھر وقار الملک کے نام سے مشرف بہ اسلام ہوا۔ وہ سلمیٰ کو حاصل کرنے کے لیے نام کی حد تک وقار الملک بن گیا جس طرح نام کی حد تک کرشن چندر تھا۔
سلمیٰ کی والدہ نے جو اس وقت موجود تھیں، بنارس کے رواج کے مطابق سلمیٰ کے ماتھے پر بندیا لگائی اور مہارانی صاحبہ جہانگیر آباد اور دیگر دوستوں کی موجودگی میں جہانگیر آباد پیلس میں ان کا نکاح ہو گیا۔ اکیاون ہزار مہر بندھا۔
کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی بڑے البیلے اور انوکھے میاں بیوی ثابت ہو رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے عاشق بھی تھے، محبوب بھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ دو جسموں کا نہیں، دو بھٹکتی ہوئی روحوں کا ملاپ ہو۔ دونوں میں اتنی زیادہ ذہنی ہم آہنگی تھی کہ اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے لطف حاصل کرتے رہے۔ سلمیٰ نے اس کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی۔ اس کا خیال بچوں کی طرح رکھتی، وہ بھی جواب میں اس کے دکھ درد کا ساتھی بنا ہوا تھا۔ گھر میں دعوتیں ہوتیں، دوست جمع ہوتے تو کرشن کو ویسی شرمندگی نہ ہوتی جیسی دریا دتی کی موجودگی میں ہوتی تھی۔ اب وہ بہترین میزبان کے فرائض انجام دے رہی تھی۔
سلمیٰ کے آنے سے پہلے کرشن کے لکھنے کے لیے کوئی میز تک نہیں تھی۔ سلمیٰ نے اس کے لکھنے پڑھنے کا اہتمام کیا۔ اسے اتنی ذہنی فرصت دی کہ وہ بے فکر ہو کر تخلیقی کام کرسکے، غرض سلمیٰ کے آنے کے بعد کرشن کی دنیا ہی بدل گئی۔
سوہن راہی انگلستان سے ہندوپاک کلچرل کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ وہ ابراہیم جلیس کے ساتھ کرشن چندر سے ملنے بھی آئے۔ اس کی مہمان نوازی ضرب المثل تھی۔ اس کے دوست آئے تھے۔ ان کی خاطر داری اس پر فرض تھی۔ وہ انہیں کھانا کھلانے ایک ہوٹل میں لے گیا۔
"معاف کیجئے گا، مجھے ایک کام یاد آگیا ہے۔ آپ لوگ بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔"
"واہ، یہ کیا بات ہوئی۔ ہمیں بٹھا کر خود جا رہے ہو۔"
"بس بات ہی ایسی ہے۔ یوں گیا اور یوں آیا۔"
کرشن نے ہوٹل سے نکلتے ہی ٹیکسی پکڑی اور اپنے ایک دوست کے گھر پہنچ گیا۔
"یار، کچھ دوست آگئے ہیں۔ انہیں کھانا کھلانا ہے۔ کچھ پیسے ہوں گے تمہارے پاس؟"
"کتنے؟"
"سو روپے میں کام چل جائے گا۔"
"کیا ابھی چاہییں ہیں؟"
"انہیں ہوٹل میں بٹھا کر تمہارے پاس آگیا ہوں۔"
"جب تمہارے پاس پیسے نہیں تھے تو انہیں ہوٹل لے کر ہی کیوں گئے؟"
"اب انہیں تو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"
اس دوست نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور سو روپے اسے دے دیے۔
سوہن راہی اور ابراہیم جلیس کو یہ معلوم بھی نہ ہوسکا کہ وہ کس کام سے باہر گیا تھا۔
دوست تو خوش ہو کر چلے گئے لیکن وہ گھر پہنچ کر بہت دیر تک سوچتا رہا کہ سلمیٰ کی محبت میں اسے خیال ہی نہیں رہا۔ تنگ دستی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ آج مجھے دو دوستوں کی دعوت کے لیے ایک تیسرے دوست سے ادھار لینا پڑا۔ اس نے اب جو غور کیا تو دور دور تک امید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ دہلی اس کے لیے بنجر زمین کی طرح تھی جو اس کے اخراجات کی کفیل نہیں ہوسکتی تھی۔

اس نے سامانِ سفر باندھا اور بمبئی واپس جانے کی ٹھانی۔ اس کی پہلی بیوی اپنے بچوں کے ساتھ بمبئی والے مکان میں رہ رہی تھی۔ وہ سلمیٰ کو لے کر اس گھر میں نہیں جاسکتا تھا۔ وہ بار بار اس دور کو یاد کررہا تھا جب وہ ایسے ایسے کئی گھر خرید سکتا تھا لیکن اس نے ساری خوش حالی شراب میں بہادی اب سلمیٰ کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

بمبئی پہنچ کر اس کے سامنے دو مسئلے تھے۔ کام کی تلاش اور رہنے کا ٹھکانا۔ مکان کا مسئلہ تو یوں حل کیا کہ ایک ہوٹل میں قیام کرلیا اور کام کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

فلمی دنیا کی حقیقت اس پر اب کھلی۔ وہ احباب جو اس کے چمکتے ہوئے دور میں اس سے ملنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے، وقت بگڑا تو اب ملنے سے بھی کتراتے تھے۔ ایک سلمیٰ تھی جو اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ دو سال کی غیر حاضری سے فلمی دنیا سے اس کے روابط ختم ہوچکے تھے۔ ان روابط کو بحال کرنے کے لیے اسے سخت جدوجہد کا سامنا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس بے وفا شہر کو چھوڑ کر کسی اور طرف نکل جاتا لیکن سلمیٰ اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ وہ یہیں رہ کر کچھ کرنا چاہتا تھا۔

اس کی جدوجہد کام آئی اور اسے فلموں میں پھر سے کام ملنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم جم گئے۔۔۔ زندگی پھر سے مسکرانے لگی۔

اس کی دونوں بیویاں ایک شہر کے دو الگ الگ مکانوں میں رہ رہی تھیں۔ ایک کے ساتھ کرشن رہ رہا تھا، دوسرے کے ساتھ اس کے بچے لیکن وہ پہلی بیوی سے غافل نہیں تھا۔ اس سے علیحدگی اختیار کرلی تھی لیکن ہر ماہ باقاعدگی سے ایک معقول رقم پہلی بیوی کو بھیجتا تھا۔

اس نے پہلی بیوی کی کفالت سے منہ نہیں موڑا تھا لیکن وہ اس کانٹے کو اپنے دل سے نہیں نکال سکی کہ کرشن نے سلمیٰ سے شادی کرلی ہے۔ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اس نے کرشن اور سلمیٰ پر فوجداری مقدمہ دائر کردیا۔

کرشن پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے پانچ سال قبل مہندر ناتھ (کرشن کا بھائی) کے فلیٹ میں سلمیٰ صدیقی سے ہندو رسم و رواج کے مطابق شادی کرلی تھی۔ یہ شادی ایک بیوی کی موجودگی میں ایک غیر قانونی فعل تھا۔

اس مقدمے کے دائر ہوتے ہی کرشن اور سلمیٰ کے وارنٹ نکل گئے۔

ان دونوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ضمانت پر رہائی تو عمل میں آگئی لیکن مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا۔

یہ الزام ہی سراسر غلط تھا۔ اس کی شادی کو پانچ سال نہیں صرف دو سال ہوئے تھے اور یہ شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پاس نکاح نامہ اور تمام ثبوت موجود تھے۔

ودیا وتی نے بھی جھوٹے گواہ تیار کیے تھے جنھوں نے کرشن کے خلاف گواہی دی۔

۲۱ جولائی ۱۹۶۳ء کو اس مقدمے کی پہلی پیشی ہوئی اور پھر چند پیشیوں میں جھوٹ ظاہر ہوگیا۔

کرشن نے نکاح نامہ اور دوسرے ثبوت پیش کرکے نجات حاصل کرلی۔

کرشن نے اپنے بھائی کو خط لکھا۔

"اب تم خود سوچ لو یہ عورت (ودیاوتی) کیسی ہے اور ماں جی کو بھی بتادو جو دن رات ودیاوتی کے غم میں گھلی جاتی ہیں۔"

وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ کیسی عورت ہے لیکن اس مقدمے کے بعد بھی اس نے ودیاوتی اور اپنے بچوں کی کفالت سے دستبردار ہونا یا کوئی انتقام لینا پسند نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی دو تہائی تصنیفات کی رائلٹی کا حق دار ودیاوتی کو قرار دیا تاکہ اس کے بعد اسے کسی کا دستِ نگر نہ ہونا پڑے۔

تینوں بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ دی۔ بڑی بیٹی کے لیے خود رشتہ ڈھونڈا اور شادی کرائی۔ معذور بیٹی کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ بیٹے کی شادی بھی اس نے ہی کرائی۔

اسے ۱۹۶۲ء میں "سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" عطا کیا گیا۔ اس اعزاز میں اس کی پندرہ دن کی روس کی سیر و سیاحت بھی شامل تھی۔ کرشن تو سلمیٰ کے بغیر ادھورا تھا۔ اس نے سلمیٰ کو ہمراہ لے جانے کے لیے روسی سفارت خانے سے اجازت چاہی جو اسے مل گئی اور وہ روس کی چوتھی ادبی کانفرنس میں شرکت کے لیے سلمیٰ کے ہمراہ ماسکو روانہ ہوگیا۔

پہلی شام جب کرشن اور سلمیٰ ڈنر کے لیے ہوٹل ماسکو کے وسیع ڈائننگ ہال میں کھانے کے لیے پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ہر ملک کے نمائندے کے لیے ایک میز آراستہ ہے جس پر اس ملک کا چھوٹا سا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ تقریباً تین میزوں کے فاصلے پر پاکستان کی میز تھی۔ پاکستان کی نمائندگی فیض احمد فیض کررہے تھے۔ وہ منظر دیدنی تھا جب فیض اور کرشن کی نظروں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ دونوں درمیان کی کسی میز پر مل گئے۔ انھوں نے اپنے اپنے جھنڈے

اس میز پر رکھ دیے اور ایک دوسرے کے گلے مل گئے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

"کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ۔ کیا ہم لوگ بھی اپنے بغض و عناد رکھنے والے سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ادب میں یہ دشمنی نہیں چلتی اور کاش کبھی نہ چلے۔"

"مگر اس بدقسمتی کو کیا کہئے کہ تمہاری میری ملاقات اب نہ ہندوستان میں ہوتی ہے نہ پاکستان میں۔ ہوتی ہے تو ماسکو میں۔"

"ان لوگوں کو چاہیے 'اپنی روسی ادیبوں کی کانفرنس ہرسال کیا کریں۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر جام سے جام ٹکرانے لگے۔ دو جھنڈے ساتھ ساتھ لہرانے لگے۔

اس کانفرنس کے بہانے اسے دنیا بھر سے آئے ہوئے اشتراکی ادیبوں سے ملنے کے مواقع ملے۔ روس کے تاریخی اہمیت کے مقام کو محقق کے ذہن سے پرکھا اور اپنے دائرۂ علم و دانش کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا۔

ماسکو سے وہ دونوں ہنگری کی سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ وہاں انہوں نے نہ صرف قابلِ دید مقامات اور مصوری اور مجسمہ سازی کے نوادرات دیکھے بلکہ ملک کی سماجی معاشی' ثقافتی زندگی کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ان معلومات نے اس کے افسانوں کو ایک نئی زندگی سے آشنا کیا۔

○☆○

کرشن سے شادی کرنے کے بعد سلمیٰ بہت سے رشتوں سے بچھڑ گئی تھی۔ اس کے باپ رشید احمد صدیقی نے اس رشتے کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا بلکہ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ سلمیٰ نے کرشن سے شادی کرلی۔ اس دکھ نے انہیں اتنی تکلیف پہنچائی کہ انہوں نے گھر سے نکلنا' احباب سے ملنا تک کم کردیا۔ اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے انہوں نے لکھا۔

"میرے لیے اب زندگی میں کیا رہ گیا ہے۔ منہ لپیٹے گھر میں پڑا رہتا ہوں۔"

انہیں اس شادی سے دلی اذیت پہنچی تھی۔ بیٹی کی محبت میں وہ کبھی کبھی اسے خط لکھ دیا کرتے تھے لیکن کرشن کو انہوں نے کبھی داماد نہیں سمجھا۔ وہ اس کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے تھے۔

گجرال کمیٹی کے ایک اجلاس کے دوران میں کرشن نے گیان چند سے اپنے اس دکھ کا اظہار کیا۔

"رشید صاحب کبھی میرا نام لینے کے روادار نہیں۔ میرا نام بمبئی رکھ چھوڑا ہے۔ سلمیٰ کو خطوط میں یہ لکھ کر پوچھتے ہیں۔ "بمبئی والوں کا کیا حال ہے؟ بمبئی کا مزاج کیسا ہے؟" وغیرہ۔"

سلمیٰ کی والدہ البتہ کبھی کبھی بمبئی آکر سلمیٰ سے ملتی تھیں۔ کرشن ان کی ویسی عزت کرتا تھا جس کی وہ مستحق تھیں۔ وہ بھی حقیقی داماد کی طرح کرشن کا خیال رکھتی تھیں۔

یہ تو ہونا ہی تھا۔ سلمیٰ کو معلوم تھا یہ ہوگا لیکن کرشن جس چاؤ سے اس کا خیال رکھ رہا تھا' جس محبت کا برتاؤ کررہا تھا سلمیٰ کے لیے وہی بہت تھا۔ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ سلمیٰ اپنے دل کو تسلی دیے جارہی تھی۔

○☆○

ہنگری کی سیاحت سے لوٹنے کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کبھی دوسرے اسے مدعو کررہے تھے کبھی اس کے گھر اہتمام ہورہا تھا۔

"واہ واہ! کیا مرغ مسلم ہے۔ شاہی کباب کا تو جواب نہیں۔ بریانی بھی مزے کی ہے مگر بھنا گوشت بے مثال ہے اور یہ شاہی ٹکڑے۔ جی چاہتا ہے انہی ٹکڑوں پر پڑے رہئے۔ یہ دہی بڑے ہیں۔ یہ تلی ہوئی مچھلی ہے۔"

سلمیٰ اسے منع کررہی ہے لیکن وہ کسی سرکش بچے کی طرح ایک ایک چیز کو چکھ رہا ہے۔

غذا کی طرف سے بے احتیاطی' شراب کی کثرت اور تھکن نے اسے بیمار ڈال دیا۔

۲۳ نومبر ۱۹۶۷ء کو اس پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ مشہور ماہر امراض قلب ڈاکٹر وکیل کو فوراً طلب کرلیا گیا۔ سلمیٰ اسے اسپتال بھیجنے پر تیار نہیں تھی لہٰذا اس کی دیکھ بھال کے لیے دو نرسیں مقرر کردی گئیں۔ آکسیجن اور دوسرا سامان بھی گھر پر ہی مقرر کردیا گیا۔

ایک مہینے تک اس کی حالت تشویش ناک رہی اور پھر آہستہ آہستہ اس کی حالت سدھرنے لگی۔

تین مہینے کے علاج کے بعد وہ پھر سے معمولاتِ حیات میں مصروف ہوگیا۔

وہ صحت یاب ہوگیا تھا لیکن اس کی شخصیت کی جاذبیت رخصت ہونے لگی تھی۔ اس کے چمکیلے بال اس کی چندیا سے غائب ہوتے جارہے تھے۔ عینک کے موٹے موٹے کانچ کے ٹکڑوں کے پیچھے اس کی آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئی تھیں۔ اس کے بشاش چہرے پر سوچ' پریشانی محنت اور دوڑ

دھوپ نے گہری لکیریں ڈال دی تھیں۔ اگر جوان تھا تو اس کا فن۔

اُردو ادب کے شاید ہی کسی دوسرے ادیب کو ایسی عزت ملی ہو جو اسے حاصل تھی۔ اس کے ہم عصر افسانہ نگار اس کی زبان سے اپنے لیے ستائش کا ایک کلمہ سننے کی خواہش کرتے تھے۔ وہ جہاں جاتا اس کے مداحین اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ آٹوگراف لینے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ انٹرویو لینے والے اسے چین نہیں لینے دیتے تھے۔ شہر میں ادبی نشستیں منعقد کی جاتیں جہاں اسے کہانیاں سنانی پڑتیں۔ حتیٰ کہ مشاعروں تک میں جہاں لوگ غزلیں سننے آتے ہیں اسے افسانہ پڑھنے کے لیے کھڑا کردیا جاتا۔

اس کی مروت اور عاجزی یہ گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ کسی کا دل ٹوٹے۔ اس کی صحت جواب دے رہی تھی لیکن وہ اپنے مداحوں کی آواز پر محفل محفل، شہر شہر گھوم رہا تھا۔

۱۸ مارچ ۱۹۶۹ء کو اس کا پچپن سالہ جشن بمبئی کے برلا ہال میں بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اس جشن میں شرکت کے لیے اندرا گاندھی خاص طور پر دہلی سے تشریف لائی تھیں۔

اگلے دن کی رات ساڑھے چار بجے اس کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے اس کی حالت نازک بتائی اور اسپتال میں داخل کرانے کا مشورہ دیا۔

سلمیٰ کو اسپتال کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ وہ رونے لگی اور اپنے فیملی ڈاکٹر سنگل سے کہا کہ ان کا علاج گھر پر ہی کیا جائے جیسا کہ پہلے دورے کے وقت کیا گیا تھا۔ اس کی خواہش کا اس مرتبہ بھی احترام کیا گیا۔

طویل بیماری کے دوران کئی نشیب و فراز آئے۔ حالت بگڑی، سدھری اور پھر بگڑی اور پھر سدھر گئی۔ قسمت نے یاوری کی اور چھ مہینے بستر پر پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

ڈاکٹروں نے غذا پر خاص پابندی لگادی تھی۔ شراب کے لیے بھی منع کردیا تھا لیکن سلمیٰ کی سخت نگرانی کے باوجود نہ شراب اس سے چھوٹ سکی نہ چٹپٹے کھانے۔ راتوں کو جاگنا بھی نہیں چھوڑ سکا اور دوستوں کی محفلیں بھی نہیں چھوٹ سکیں۔ قدردانوں کی فرمائشیں بھی پوری کرتا رہا۔

اس روز بھی آدھی رات تک دوستوں کے ساتھ رہا۔ کھانا بہت عمدہ تھا، شراب بہت اچھی تھی۔

"سب کچھ نوکروں میں مت بانٹ دینا۔ تھوڑے سے کباب اور بریانی میرے ناشتے کے لیے رکھ لینا۔ صبح اٹھ کر یہی ناشتا کروں گا" کرشن نے دوستوں کے رخصت ہونے کے بعد سلمیٰ سے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

درد کی شدت سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ پھر گھبرا کر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ڈاکٹر صاحب، جلدی آیئے۔ مجھے دل کا دورہ پڑا ہے، بہت درد ہے۔"

آواز سن کر سلمیٰ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گئی۔

"سلمیٰ! مجھے لٹادو۔ دم گھٹ رہا ہے۔ بہت درد ہے۔"

پندرہ منٹ نہیں گزرے تھے کہ اس کا فیملی ڈاکٹر کے ایل سنگل پہنچ گئے۔

"تم ٹیلی فون پر احباب کو اطلاع کردو" کرشن نے سلمیٰ سے کہا۔

تھوڑی دیر میں سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، راہی معصوم رضا وغیرہ آگئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اسی رات اس کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اور اب حیران تھے کہ چند گھنٹوں میں یہ کیا ہوگیا۔

اس مرتبہ سلمیٰ کی ضد نہیں چلی۔ کرشن کی حالت اتنی خراب تھی کہ اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔

کرشن کو انجکشن لگا کر سلا دیا گیا تھا۔ سلمیٰ ایک خاموش تماشائی کی طرح کسی گہری سوچ میں بیٹھی تھی۔ شاید وہ ان یادوں کو تازہ کررہی تھی جو کرشن سے اس کی سترہ سالہ رفاقت سے وابستہ تھیں۔

یک لخت مشین میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ کرشن نے گردن موڑ کر مشین کی طرف دیکھا۔ دونوں طرف خطرے کی روشنی چمک رہی تھی۔ بھگدڑ سی مچ گئی۔ کرشن کو اسٹریچر پر لٹادیا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں حیرت تھی۔

"سلمیٰ!"

"ہاں۔"

"اپنا ہاتھ دو۔"

"کیا بات ہے؟"

"میں نے ان لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ میرے مرنے میں تھوڑی دیر باقی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"اگر میرے پاس صرف اتنا ہی وقت ہے تو علاج میں ضائع مت کرو۔ تم میرے پاس رہو۔ میں اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے سب دوستوں کو خبر کردو۔"

ڈاکٹروں نے اسے فی الحال مرنے نہیں دیا۔ آپریشن کرکے اس کے دل میں ایک آلہ (پیس میکر) لگادیا گیا اور تقریباً ایک ماہ بعد وہ گھر آگیا۔

"ڈاکٹر صاحب، میں کباب اور پلاؤ کھا سکتا ہوں؟"

صحت یاب ہوتے ہی اچھے کھانوں کے لیے اس کی رال ٹپکنے لگی۔ احباب پہلے کی طرح آنے لگے۔ ہلاکت آفریں روش پھر سے اختیار کرلی۔

دسمبر ۷۶ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن اس کے بعد اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ہر چوتھے پانچویں روز نبض چلتے چلتے رک جاتی۔

پندرہ جنوری ۷۷ء کو سلمیٰ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ کرشن نے اپنی بیماری کے باوجود ضد کرکے اسے علی گڑھ بھیجا۔

پندرہ دن بعد وہ واپس آئی تو اس نے کرشن چندر کو صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا لیکن چہرے کی طرف دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ چہرے پر زندگی کے آثار قطعی نہیں تھے۔

ایک ہفتہ ہنسی خوشی کٹ گیا۔ اس نے دو مزاحیہ مضمون بھی لکھے "ایک لڑکی بگھارتی ہے دال" اور "ایک عورتوں کا سال۔"

"چلو پھل لے آئیں" اس نے سلمیٰ سے کہا۔

"کسی اور کو بھیج دو۔"

"نکلو بھی یار اس چکر سے۔ تم لوگوں نے تو مجھے بیمار سمجھ لیا ہے۔"

بازار گیا۔ شاپنگ کی۔ مرغ لے کر آیا تھا۔ نوکر سے خاص ہدایت کے ساتھ پکوایا۔ کھانے کے بعد ٹی وی دیکھتا رہا اور پھر دوائیاں کھا کر سوگیا۔

"دل گھبرا رہا ہے ڈاکٹر صاحب! جلدی چلے آیئے۔"

پانچ منٹ بعد ہی وہ اپنے ڈاکٹر کو فون کرنے پر مجبور ہوگیا۔

اسے بمبئی اسپتال لے جایا گیا۔ اس کا بلڈ پریشر کم ہوگیا تھا جسے جلد ہی سنبھال لیا گیا۔

اگلے دن ایک بجے دوپہر تک مزے مزے کی باتیں کرتا رہا۔ چناؤ کی باتیں، سیاست اور دوستوں کی باتیں۔ ایک روسی خاتون آئیں ان سے باتیں کرتا رہا۔

دو بجے دن کے قریب اس کا بلڈ پریشر صفر پر آگیا۔ اسپتال کا پورا عملہ اس کے علاج میں مصروف ہوگیا۔ بلڈ پریشر پھر نارمل ہوگیا۔

وہ فنکار جس نے زندگی سے والہانہ عشق کیا تھا، اب مایوس ہونے لگا تھا۔ اب موت سے لڑنے کی سکت اس میں نہیں تھی۔

اسے بجلی کے جھٹکے دیے جارہے تھے جس سے اس کا پورا جسم نیلا پڑگیا تھا۔

"کوئی بات کرنی ہو تو کرلیں" ڈاکٹر نے کہا "پھر ہم انہیں بے ہوش کردیں گے ورنہ ان کے بھیانک درد ہوگا۔"

کرشن نے اپنا کانپتا ہاتھ بڑی مشکل سے سلمیٰ کی طرف بڑھایا "بس اتنا ہی ساتھ تھا۔ ویسے میں نے بھرپور زندگی بتائی۔ بس یہ دکھ ہے کہ تمہیں کوئی سکھ نہیں دے سکا۔"

ڈاکٹر نے نرس کو ٹیکا لگانے کا اشارہ کیا تو کرشن نے انگلی کے اشارے سے تھوڑی سی مہلت مانگی اور پھر رک رک کر سلمیٰ سے کہنا شروع کیا۔

"بمبئی میں مکان بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اگر ہوسکے تو گھر مت چھوڑنا۔ اگر حالات پر قابو نہ پاسکو تو پاکستان چلی جانا۔ وہاں میرے بہت سے دوست ہیں۔ تم وہاں اکیلی نہ رہوگی۔" پھر کچھ دیر توقف کے بعد اس نے کہا "سلمیٰ! میرے مرنے کے بعد تم جس طرح چاہو میری آخری رسومات ادا کرنا۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ دونوں ہاتھ بڑھا کر سلمیٰ کے گلے میں ڈال دیے اور آہستہ سے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

وہ بے مثال کہانیاں یتیم ہوگئیں جو اس کی تخلیق تھیں اور جنہیں وہی تخلیق کرسکتا تھا۔ افسانہ نگاری کے ماتھے کا جھومر اور مانگ کی افشاں۔ کرشن چندر اب اس دنیا میں نہیں تھا۔

اس کی ارتھی تیار ہوچکی تھی۔ ایک طرف قرآن خوانی ہورہی تھی، ایک طرف وید اور گیتا کا پاٹھ ہو رہا تھا۔

سلمیٰ نے دو زانو بیٹھ کر آخری مرتبہ کرشن چندر کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور پھر اس کے منہ پر منہ رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کچھ اس طرح کہ اس کو سنبھالنا دشوار ہوگیا۔ بہ مشکل اسے خواب گاہ میں پہنچایا گیا۔ کرشن کے لکھنے کی میز پر اس کا چشمہ نیلے رنگ کا پیڈ اور قلم پڑا تھا۔

"کرشن میرا ہم پیشہ بھی تھا ہم راز بھی۔ اسے پہلا کندھا میں دوں گا" راجندر سنگھ بیدی نے کہا "رام نام ست ہے۔"

ارتھی کو آگے سے راجندر سنگھ بیدی.... اور خواجہ احمد عباس نے اٹھایا اور پیچھے سے رامانند ساگر اور مجروح سلطان پوری نے۔ ہندو، مسلم، سکھ احباب نے اسے شمشان گھاٹ تک پہنچایا۔

اس کے بیٹے رنجن نے اپنے پتا کی چتا کو آگ دی اور کرشن کو شعلوں نے اپنی آغوش میں لے لیا۔